رجسٹرڈ آصفیہ نشان

ترجمان

حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ابوالمکارم محمد انوار اللہ

تمام قیمت پانچ روپیہ سالانہ معہ محصول

مطبع تاج پریس میں چھپکر

دفتر رسالۂ ترجمان اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتے میں کم سے کم تین جز کا حیدرآباد دکن سے شایع ہوگا۔

(۲) عدم وصول پرچے کی اطلاع ہر ماہِ ہلالی کی ۱۵ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائیگا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابلِ طبع متصور ہوں وہ خرچۂ ڈاک آنے پر واپس کر دئے جائینگے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ ہو۔

(۷) اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعہ خط و کتابت یا بالمشافہ ہے۔

(۸) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ سرکار سے ([illegible]) عام سے ششماہی ([illegible]) نمونہ ۔

نیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترجمان

جلد ۱ — بابت ماہ ربیع الاول مبارک ۱۳۴۷ھ — نمبر ۱

فہرست مضامین

ب

اطلاعات

میری مسلسل ایک ماہ سے زیادہ مدت کی علالت کی وجہ جس کا اس وقت تک بھی سلسلہ ہے اس پرچے میں بعض فروگزاشتیں اور اکثر کمیاں او خرابیاں رہ گیئں جس کا خود مجھے بدرجہ اتم افسوس ہے، ناظرین ان کو نظر انداز فرمادیں، ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ نمبروں میں ان کے ارتفاع کی کوشش کی جاے گی،

اس زمانے میں جبکہ قرآن کریم، اور اس کی تعلیم کی طرف سے، عام لاپرواہی برتی جارہی ہے، حضرت مولانا عبد اللہ العمادی صاحب مدظلہ کا (قرآن کریم کے ان آیات کے مطالب کی، جن میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں تحقیقات کی طرف رجوع ہونا ایک بہت ہی مستحسن اور قابل تشکر امر ہے،

مولانائے ممدوح نے اپنی یہ قیمتی تحقیقات، غائت کرم سے "ترجمان" کو عنایت فرمائی ہے، اور یہ ایک نہایت مبسوط و مفصل سلسلہ ہے، اگرچہ کہ یہ مبارک سلسلہ پہلے نمبر سے ہی شروع ہوجاتا لیکن مجھ بدبخت کی علالت کی وجہ، پرچے کی ترتیب وقت پر نہ ہوسکی اس لئے یہ سلسلہ پہلے نمبر سے شروع نہ ہوسکا، ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے نمبر سے یہ مبارک سلسلہ شروع ہوگا۔

حیات تمدن، دراصل حضرت آصف جاہ اول کی سوانح عمری ہے، جیسا کہ رسالہ "ترقی" میں مضمون سے متعارف کرتے وقت تبلا دیا گیا ہے، اس کا سلسلہ رسالہ "ترقی" سے مل جاتا ہے،

حجاز کے فرنگی سیاح کے متعلق ہمارے پاس اکثر خطوط وصول ہورہے ہیں کہ جس قدر سیاحوں کا حال "ترقی" میں طبع ہوا ہے، وہ کتابی صورت میں ایک جا جمع کردیا جائے۔

ہم اس فرمائش کی تعمیل سے، اس لئے قاصر ہیں کہ پریس ہمارا ذاتی نہیں،

شذرات

سب سے پہلے ہم نہایت جوش قلب، اور انبساط روح کے ساتھ، اپنے معزز قارئین و معاونین کو جشن ولادت باسعادت حضرت سردار دو کونین، وسیلہ دارین، رحمۃ اللعالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی نوید دیتے ہیں، خدا ہم کو توفیق دے کہ اس سعید اور مبارک موقعہ پر خیرات ومبرات، اور اعمال وجذبات حسنہ میں کوئی کمی نہ کریں،

چنانچہ اس پرچے کی ترتیب میں یہی مطمع نظر ہمارا رہا ہے، اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ وسلم

گزشتہ ماہ ذیحجۃ الحرام کے وسط میں جس رسالہ "ترجمان" کے شایع ہونے کی اطلاع دی گئی تھی، الحمد للہ کہ وہ آج نظر افروز ناظرین ہے،

اشاعت پرچے کی اطلاع میں عرض کیا گیا تھا کہ "ترجمان"، قائم مقام "ترقی" ہوگا، اس لحاظ سے آپ اس کو "ترقی" کی دوسری جلد کا پہلا نمبر تصور فرمائیں،

اگرچہ کہ ترقی کے بارھویں نمبر میں بہ ضمن شذرات نہایت تفصیل سے اپنی غایت اور مقصد کے متعلق بحث کرتے ہوئے بتلایا گیا تھا کہ "ترقی" کے سال جدید کے آغاز سے ہم اپنی مخصوص غایت کے متعلق ایک خاص اور اہم تصفیہ بتلائینگے، چونکہ اس ذیل میں ہماری آئندہ مخصوص غایت کے متعلق سرسری طور پر اشارہ بھی تھا جس پر معزز معاصرین "صلائے عام دہلی" اور "تحریک لاہور" وغیرہ نے بھی لبیک کہی تھی لیکن "ترقی" کو بند ہوئے دو سال گزر چکے، اور اس نے اپنی ایک سالہ حیات میں جو مخصوص ماحول اپنے دائرہ عمل میں پیدا کیا تھا اس میں بہت کچھ انقلاب نظر آرہا ہے، اس لئے ہم فی الحال عام روش سے ہٹ کر چلنا نہیں چاہتے، اور انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد اپنی مخصوص غایت اور ارادوں کا اعلان کرینگے،

کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری آواز "تنہا" اور "غیر مانوس" ہونے کی وجہ سے کوئی "بدمذہب" فتویٰ نہ حاصل کرلے،

حضور پُر نور اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے زمانے میں ریاست حیدر آباد میں جو جو ترقیات ہوئے اور ہو رہے ہیں، وہ آفتاب کی طرح چمک رہے ہیں، خصوصاً ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے جو جو توجہات گرانمایہ مبذول ہوئے وہ صدیوں سے ارض مشرق میں معدوم تھے،

عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کے لئے دار الترجمہ کا قیام وہ مبارک چیز ہے جس پر کل ارض مشرق کو فخر و ناز ہو سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہم میں سے بعض ایسے بھی بدبخت ہیں جو باوجود آفتاب کو دیکھنے اور اس کی ضیا پاشی سے استفادہ بھی کرنے کے، پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ "آفتاب نہ آفتاب ہے اور نہ عالمتاب"!

لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر کلیہ میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں، اسی طبقے میں جس کا سواد اعظم اب تک آزادی کا حقیقی مفہوم نہیں سمجھا، اکثر اور بیشتر ایسے روشن خیال حضرات بھی نظر آتے ہیں، جو اپنی وسیع النظری کے ساتھ، اپنے فرائض اور ودعاوی ئے آنک حلالی سے بھی بخوبی واقف ہیں، اور بہ تقضائے شرافت اپنی حقیقت کو سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں، اور صاحبان ذوق و درد سے داد پاتے ہیں،

ہندوستان کی تاریخ اس قسم کے بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ہم نے اپنے سچے جان نثاروں کو ہر طرح نوازا، اور ان کی وفاداری کی سچی قدردانی کی، اور اس قدردانی کا بدلہ بھی اُن کی طرف سے بہت عمدہ ملا، مگر ایسے افراد گنتی ہی کے ہیں، خدا ہمارے دوستوں کو توفیق دے کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں، اور بے نتیجہ کورنکمی اور شور و غوغا سے باز رہیں، ان کی تقدیر ان پر واضح ہے، اور ظاہر ہے کہ تقدیر و قسمت کے علاوہ انسان کو کچھ نہیں مل سکتا،

"پلانٹرز جنرل اگریکلوسٹ" کے حوالے سے مقامی معاصر "رہبر دکن" راوی ہے کہ ریاست "میسور" اور امریکہ کے مشہور کارخانہ "فورڈ" کے مالک "ہنری فورڈ" کے مابین ایک ایسی گفت و شنید ہوئی ہے جس کی رو سے "فورڈ" کا ایک کارخانہ ریاست میسور میں قائم کیا جائے گا، مابعد الذکر (فورڈ) کارخانہ کا کام انجام دیگا اور ماقبل الذکر (ریاست میسور) سامان بہم پہنچائیگی۔

ریاست میسور کی ہر ترقی، نہ صرف دیسی ریاست ہونے کی وجہ سے، بلکہ اس سے ہمارا ایک

قدیم تاریخی تعلق ہونے کی وجہ سے ہماری مسرت کا باعث ہوی ہے اب ریاست مذکورہ نے قیام کارخانہ فورڈ کے لئے جو اپنا قدم بڑھایا ہے وہ بعض حیثیتوں سے نہایت ہی مبارک ہے، از انجملہ اس گفت وشنید سا عملی قدم جہاں ریاست مذکور کو اقتصادی فواید بخشے گا، وہاں غریب طبقے کے افلاس کے دور کرنے میں بھی بہت کامیاب ہوگا۔

مبارک دورِ عثمانی کے بیشمار برکات کے منجملہ ہماری ریاست میں سررشتہ صنعت وحرفت کا بھی قیام ہے، اس سررشتہ نے اب تک جو کام انجام دئے ہیں وہ اگرچیکہ ترقی پذیر اور امید افزا ضرور ہیں، لیکن ہم ہمیشہ آرزومند ہیں کہ آٹا پیسنے کی گرنیوں اور موٹر سروس کی اجازتوں یا پریس جیسے شعبوں کی امداد سے زیادہ مفید امور کی طرف توجہ کریگا۔

اس کے علاوہ ہم کو یہاں اور دو کارخانے نظر آتے ہیں جن میں سے ایک دار الضرب و کارخانہ برقی ہے جو بالکل سرکاری ہے، اور دوسرا کارخانہ کارخانۂ شمشیر جنگ" کہلاتا ہے، جو یہاں کے ایک نواب کے شوق اور ہمدردی کا نمونہ ہے، ان دونوں کارخانوں میں سے اول الذکر کارخانہ، مسکوکات سرکاری ڈھالتا، اور سڑکوں پر برقی روشنی کرتا اور کچھ سرکاری موٹریں درست کرتا ہے، اگرچیکہ مبارک دورِ عثمانی میں اس کارخانے نے مسٹر گیلن کے زیر نگرانی جو کچھ بھی ترقی کی وہ قابل اعتنا ضرور ہے، از انجملہ ٹکنیکل اسکول کا قیام ہے، تاہم اس کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے بہت کچھ کرنا چاہئے، اس کے متعلق ہم کو امید ہے کہ بہت جلد توجہ فرمائی جاسے گی،

اب رہا کارخانۂ ثانی الذکر جس کا کام اکثر و بیشتر ہماری نظر سے گذرا اس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک خانگی حیثیت رکھنے کی وجہ بہت کچھ قابل ستایش ہے، اور ضرورت ہے کہ یہاں کی سرمایہ دارہستیاں، نواب شمشیر جنگ بہادر کے اس مبارک عمل کی تقلید کی طرف قدم بڑھا کر ملک کی اقتصادی ترقی، اور غریب طبقے کے افلاس کے دور کرنے کا باعث بنینگی، کیونکہ یہ ایک احمقانہ تصور ہے کہ جو کچھ بھی کیا جاے سرکار ہی کی طرف سے کیا جاسے،

اوائل جولائی ۱۹۲۵ء میں عثمانیہ مڈیکل کالج کے امتحان کا نتیجہ شایع ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے کامیابی حاصل کی ہے:۔

(۱) بی بالا ریڈی (۲) وی سبا راؤ (۳) ڈی نرسمہواں راؤ (۴) کے یم رودرپا
(۵) بی یس مادھوراؤ (۶) منور حسین (۷) بی وی رنگاریڈی (۸) ناگیہ سنگھ
(۹) جی بالکرشنا (۱۰) امرناتھ ورما (۱۱) رستم جہانگیر (۱۲) بی یس اپنا
(۱۳) وی ٹی سدرشنا نام (۱۴) ٹی ونیکنا (۱۵) اے جوشی (۱۶) محمد عبداللہ
(۱۷) وی راج گوپال (۱۸) بی کے نائیڈو (۱۹) وی ڈی سرمشیوم (۲۰) مس یل یم ریڈی
(۲۱) سید شفیع الدین (۲۲) یم اے رشید (۲۳) یم بی یوراج سنگھ (۲۴) اے سی نون سی کا
(۲۵) وی آر ایشور (۲۶) کی وی سبیا (۲۷) کیا بدانم (۲۸) بی یس راؤ
(۲۹) یچ ای اوس (۳۰) اڑ وی جوشی (۳۱) ابوالعلی خاں (۳۲) ین وی کرشنا راؤ
(۳۳) بی مانک چندرا (۳۴) جی ایس انگیار (۳۵) ناگا وتھنم (۳۶) بی وینو گوپال
(۳۷) ین جی سبیا (۳۸) ٹی بھاسکر راؤ (۳۹) یس یس پونلے (۴۰) آر جی گارڈ
(۴۱) ڈبلیو جی جاگیردار (۴۲) اے جی نارائن راؤ (۴۳) ین جی جنچولی کر (۴۴) نیلکنٹھ راؤ
(۴۵) ٹی بھار سی کر (۴۶) بی سری رالمو (۴۷) یس ٹی سامبل (۴۸) بی ایل سبا راؤ
(۴۹) حمید اللہ خاں (۵۰) ٹی وی نارائن راؤ (۵۱) یم سندر راج (۵۲) ایل کرجن راؤ
(۵۳) مس سی رنگا نایکا (۵۴) ڈی ین مارامٹی (۵۵) کے گوپال راؤ (۵۶) واسدیو نانک بھوسی
(۵۷) وی یم رگھوناتھ راؤ (۵۸) جی یس سدلانم (۵۹) کے سیوپا (۶۰) کے سری نواسن
(۶۱) مس یچ بجن (۶۲) یم سی ونکٹ راؤ (۶۳) آر جے جادور ....

یہ نتیجہ مقامی اخبارات میں شائع بھی ہوا اور تقریباً سب نے دیکھ بھی لیا لیکن ہم کو اس نتیجے میں بہت کچھ سرمایۂ عبرت نظر آتا ہے جس کا اقتضاء یہی ہے کہ اس کو بار بار شائع کیا جائے اور لوگ دیکھتے جائیں۔

بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام

اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و الہٖ بعدد حسنہٖ و جمالہٖ

خراباتیاں مے پرستی کنند　　محمد بگویند و مستی کنند
بہر نقش پایش ہزاراں سجود　　نثار قدش رخت ہستی کنند

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ماجاءتھم البینات بغیا بینھم فھدی اللہ الذین امنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم (سورۃ البقرہ)

یعنی کافۂ ناس من حیث المجموع ایک ہی طبقے پر مشتمل ہیں، پس مبعوث کیا اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو اُن پر جن کے فرائض میں تھا کہ بشارت مغفرت کے ساتھ، اس کے قہر و غضب سے بھی ترساں و لرزاں کریں (اور نہ صرف انبیاؑ کو بھیجا بلکہ) ان کے ساتھ ایک کتاب (دستور العمل) بھی نازل فرمائی، جس کی وساطت سے امت کے مختلف فیہ جھگڑوں میں، محاکمہ کیا جاتا تھا، در آنحالیکہ بنائے اختلاف ڈالنے والے بھی وہی لوگ تھے (جن کے لئے وہ دستور العمل نازل فرمایا گیا، نیز باہمی آویزش میں بھی مبتلا رہے، باوجودیکہ ان کے اوپر تسلی و تشکین توضیحات روشن تھے، پس جو لوگ کہ امور حقہ میں بر سر تخالف تھے، ان کو اللہ عزوجل نے اپنی رضامندی سے راہ ہدایت دکھائی، اور بیشک بہبودی اور بھلائی کا طریق اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔"

آیت مذکورہ میں انبیاء کی بعثت مع الکتاب کے فلسفے پر نہایت جامع و مانع طریق پر اجمال کیا گیا ہے چنانچہ اس اختصار میں بھی آیت شریف میں متعدد پہلو نظر آتے ہیں ایک جزء سے تو اس کا اظہار مقصود ہے کہ عالم موجودات کی حالت کون و فساد ہمیشہ اس کی مقتضی رہی ہے کہ کوئی ایسی ہستی یہاں بھیجی جایا کرے جو قلوب کو درد اور امن و تسلی سے بھر دے اور اسی بنا پر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت عمل میں آتی رہی، نیز اسی حصہ میں یہ وضاحت بھی ہو گئی کہ نبیوں کی بعثت کے لحاظ سے ہر طبقہ انسان سمجھا گیا اور اللہ کی نظروں میں اقوام کی تفریق کوئی چیز نہیں ہے، دوسرا ٹکڑا یہ تبلاتا ہے کہ راہ ہدایت دکھانے والے انبیاء اکثر اپنے ہمراہ ایک خاص دستور العمل، کتاب کی صورت میں لاتے تھے، اس میں یہ باریک نکتہ مضمر ہے کہ بندوں کی نگاہوں میں اصول و ضوابط کی وقعت ہو، نہ کہ منضبطین اور واضعین کی نیز جو انتفاع کہ رسول کی ذات سے حاصل کیا جائے، وہ اس کی مبارک زندگی ہی تک محدود نہ ہو بلکہ اُن کے بعد بھی ممکن ہو سکے، تیسرا حصہ مظہر ہے کہ اس دستور العمل کا مقصد وحید یہ تھا کہ رفع اختلاف و شر اور دفع فتنہ و فساد کے وسائل مہیا کئے جائیں، اور یہی مقصد ہمیشہ اس کتاب کی تعمیل میں ملحوظ رہا، چوتھا پہلو جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ لوگوں میں سرکشی بڑھتی گئی، اور وہ اس دستور العمل سے روگردانی اور انحراف کرتے رہے، حتیٰ کہ کوئی طبقہ اور فرقہ روئے زمین پر ایسا نہیں رہا کہ جو تعلیمات الٰہیہ پر عمل پیرا ہو کر ارتقاء روحانیت اور امن عالم کا حامل ہوتا، اور کتاب اللہ کے لحاظ سے اپنے نزاعات و اختلافات مٹا کر نسل انسانی کے علو و رفعت کا باعث ہوتا، پس ضروری ہوا کہ ایک ایسا نبی مبعوث کیا جائے جو کافہ ناس کو بلا استثنا، اللہ کا پیام پہنچائے، اور قوانین الٰہیہ پر عامل کرائے، اس لئے کہ جملہ اقوام عالم ان قوانین کو جو ایک وقت ان میں رائج کئے گئے تھے، بالکل فراموش کر چکی تھیں، بعینہ جس طرح آج مختلف اقوام میں ایک عالمگیر بین الاقوامی ضابطہ، قانون اور عدالت کا قیام گو محض دکھاوے کے لئے ضروری خیال کیا جا رہا ہے، اسی طرح متفرق قومی مذاہب کے لئے بھی ایک ایسا جامع اور مرکزی مذہب ضروری تھا جو کل اقوام کے

اختلافات متنوعہ کو دور کر کے ان کو ایک متحدہ شاہ راہ پر ڈال دے،

پھر اگر یہ ضروری تھا کہ چونکہ سابقہ آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السّلام کے لائے ہوئے دستور العملوں کی تلقینات، بالکل متغیر و مسخ ہو گئی تھیں، حقیقی تعلیمات آلہیہ پر تحریف و اضافہ اور مکر و فریب کا پردہ پڑ چکا تھا، اس لئے ایک جدید فطرتی نظام العمل کی سخت ضرورت تھی، جو بھولے ہوے سبق کو پھر یاد دلاے، اور عہد عشق و محبت کی تجدید کرے، تو یقیناً نظم عالم مقتضی تھا کہ ایک اور کتاب بھٹکے ہوے بندوں پر بھیجی جاے، جو جملہ خامیوں کو دور کرکے اور کل گوہروں کو مٹاے، چونکہ جملہ اقوام عالم نہایت تاریکی و ظلمت کے ساتھ باہم متصادم تھیں، اس لئے ایک عالمگیر نیز فطرتی اتحاد کے رشتے میں ان کو منسلک کرنا ضروری تھا، بدیں وجہ وہ کتاب نازل فرمائی گئی، جو جملہ مذاہب آلہیہ کی جامع اور ہر قسم کی سابقہ تعلیمات پر من کل الوجوہ حاوی تھی، اور جس کا نام "قرآن مجید" ہے، اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

وبالحق انزلناہ و بالحق نزل،

پس اگر کسی زمانے میں پوری دنیا کو ایک ایسے ہادی کامل، اور ایک ایسی کتاب جامع کی ضرورت تھی، تو وہ وہی تھا، جب اشرف المرسلین خاتم النبین، انیس الغریبین، سیدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ اس دنیا میں تشریف لاے، اس وقت جملہ خدائی قوانین شکست کئے جا چکے تھے، ہر قوم میں گمراہی پھیلی ہوئی تھی، کفر شرک اور اخلاق رذیلہ تمام عالم میں پھیل رہے تھے، ہر قوم و ملک کا معادی و معاشی پہلو نہایت تاریک و ذلیل ہو چکا تھا، اور یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ گناہوں سے نفرت اور توبہ کرنا تو کجا، اس سے محبت اور اس کو ثواب سمجھ کر اس کے حصول کی کوشش کی جاتی تھی، اور ممکن ہے کہ اس حقیقت پر بعض نفوس کو حیرت دامنگیر ہو، مگر یہ واقعہ ہے اور اس عصر کی مذہبی روایات، اور تاریخیں، جو قدیم ایران، ہندوستان اور کلیسا پر مشتمل ہیں، اس کی صاف توضیح کر رہی ہیں، ارتقاے نسل آدم کی یہ وہ منزل تھی، جب روحانی اور مادی حیثیات سے انسان انتہائی نکبت وادبار کو پہنچ چکا تھا، عین اس وقت آفتاب اسلام

طلوع ہوا اور حق و ہدایت کے نور سے دونوں جہان روشن ہوگئے،

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگادی اک آواز میں سوتی بستی جگادی

دنیا کی ہر ہستی اور کائنات کے ہر وجود پر اس عہد پرفتن کے مقتضیات اور کشمکش کے لحاظ سے جامع طور پر صرف دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے،

۱۔ روحانی ۲۔ مادی

اول الذکر میں وہ تمام باتیں آگئیں جن کو ہم مذہبی، اخلاقی، وجدانی، انسانی امور سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور جو بالواسطہ یا بلا واسطہ ہم میں عادات حمیدہ پیدا کرتی اور خصائل ذمیمہ کی بنیاد اکھاڑتی ہیں، اور باعث ہوتی ہیں اکتساب عمل صالحہ کا، آخر الذکر ان امور پر مشتمل ہے، جو ہماری معاشی ترقی، اور دنیاوی حب وجاہ، تمول و آسودگی، تلاش اطمینان قلب کے محرک ہوتے ہیں، اور جن کے ذریعہ سے ہم اپنی متعارف عزت و آبرو کو اور حیثیت و مدنیت کو برقرار رکھنے میں ساعی ہوتے ہیں، اور جائز طور پر قوانین و اصول کے ذریعہ سے پابندیوں اور تعلقات کو

پیدا اور عائد کرتے ہیں،

چنانچہ فرمایا ہے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے "انا بشر مثلکم یوحی الی"

اب ہم بھی مذکورہ دونوں پہلوؤں سے یہ دکھاتے ہیں کہ اس سلالۂ اولادِ آدم روحی فداہ کی زندگی مقدس میں کیسے کیسے لمعات و عوارف دنیا پر ظاہر ہوتے رہتے تھے کہ جن کو اگر آج بھی ہم اپنا شمع ہدایت بنالیں، تو پھر مغرب و مشرق کو منور کر دینا کوئی بڑی بات نہیں چنانچہ اول ہم روحانیت کو لیتے ہیں،

اس حقیقت کی تاریخی وقعت مسلمہ ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا کے ایسے نبی ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی کے مبارک ایام ہی میں اس عمل اور کامرانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، جو حضور کے پیام الٰہی اور تعلیمات کا لازمی نتیجہ تھی، اس لئے کہ اس دستور العمل کا جو قرآن مجید کی صورت میں نازل کیا گیا تھا، سب سے بڑا فیض وہ اہم انقلاب روحانی ہے جو دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نہایت شدت و سرعت کے ساتھ پھیل گیا، اور جس کا نہایت بلیغ اشارہ اس کلمہ میں پنہاں ہے "ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین"

اس دستور العمل کے برقی اثر نے، ہر قسم کی خطرناک مذموم بات کو جو صدیوں سے رائج چلی آتی تھیں، ایک دم میں جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا، اور بت پرستی، شراب خواری، قماربازی، کو بالکل مٹا دیا، خونخوار اور جنگ جو اقوام کو صلح پسند و متمدن انسانوں میں تبدیل کر دیا اور یہ سب روحانیت کا ادنیٰ کرشمہ تھا، ایک بالکل سیہ قلب اور اکھڑ قوم کے افراد کو علوم و فنون کا حامل بنا کر تمام دنیا کے لئے سامان نجات مہیا کر دیا، قرآن مجید کے ایک ایک کلمے میں اس وحدہ لاشریک کی عظمت و تمجید ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جو قلب مومن سے نکل کر اس ہی پر گرتی ہے، اور اس کا یہ دعویٰ کہ "فاتوبسورۃ من مثلہ" آج تک بلا جواب کے دنیا میں پڑا ہوا ہے،

عرب سے قطع نظر کر کے بھی دیکھئے، تو قبل نزول قرآن مجید کل نسل انسانی قعر ذلت میں پڑی

ہوئی تھی، جہالت و ظلمت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ نور اور روحانیت کی ایک شعاع بھی نظر نہیں آتی تھی، قانونِ فطرت کی کوئی وقعت نہ تھی، اور ضمیر و قلب کی آواز کی کوئی عزت نہ تھی، فسق و فجور، اور جبر و ظلم کا دور دورہ تھا، اور عرب کا خطہ ان سب امور میں کہیں بڑھ چڑھ کر تھا، وہاں نہ صرف ہر قسم کی ناپاک و فحش حرکتوں کا ارتکاب کیا جاتا تھا، بلکہ اس پر پورے مجمعوں میں فخر کیا جاتا تھا، اور شاعروں میں ان قبائح پر داد لی جاتی تھی، نہایت گندے اور نجس افعال کا اظہار شاعرانہ انداز میں بے حد افتخار و غرور کے ساتھ کیا جاتا تھا، یہی قوم تھی کہ تعلیمات پر پچیس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ یکایک کل کی کل بالکل بدل گئی، وہ لوگ جو دنیا کے جاہل ترین اور فاسق ترین مخلوق تھے، علم و فضل کے حامی اور سرپرست بن گئے، وہ جو عورتوں کو بہائم سے بدتر سمجھتے تھے، اُن کے حقوق کا نہایت شدومد سے اعلان کرنے والے قرار پائے اور پھر دوسروں میں بھی انھوں نے وہی روح پھونک دی جو خود ان میں کام کر رہی تھی، کیا تاریخ اس نوعیت کے انقلاب کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ اللھم صل وسلم و بارک علیہ

غرض موجودہ میں جہاں اور بہت سے بدعات ہیں، وہاں مذہب و روحانیت کی بھی طرح طرح کی تمسیخ اور تاویل کو وضع کر دیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ فرائض کی ادائیگی، اور مذہب کی پابندی دونوں مترادف چیزیں ہیں، یا کہ اگر ایک انسان پاکیزگی، ہمدردی، اور ایثار کے ساتھ، زندگی بسر کرتا ہے تو وہ پورا پورا مذہب پر عامل کہا جا سکتا ہے، فی الحقیقت ہماری جسمانی کیفیتیں، اور جذبات و اعمال، بہت کچھ روحانی اثرات پیدا کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ روزانہ اکل و شرب بھی اس پر بہت کچھ اثر ڈالتا ہے، مگر یہ شمع سب سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے روشن فرمائی، کہ انسان کا ہر فعل خواہ وہ کسی زندگی کے کسی درجہ اور منزل میں ہو، یقیناً کسی نہ کسی بنیادی حیثیت سے مذہبی اہمیت اور روحانی جذب کا پہلو اپنے اندر رکھے گا، نیز اس کی پوری زندگی از عہد تا لحد دراصل مذہبی فرائض ہی کی ادائیگی کے ایک غیر مربوط، و غیر منتظم تسلسل کا دوسرا نام ہے، مذہب اور اُمورِ مملکت میں کوئی حدِ فاصل نہیں، علی الخصوص اسلام میں جس نے روحانیت و مذہب اور

قوانین فطرت کو باہم منطبق کرنے میں کوئی پہلو نہیں چھوڑا، حضور اکرم کی پوری زندگی اس عمل کا صحیح نمونہ تھی، حجابات تقدیر اگر آپ کی نظر شفقت کے سامنے کوئی آڑ نہ تھے، تو تدبیر سے بھی آپ نے اپنے کو مستغنی نہ ظاہر فرمایا، دُعا اور دوا دونوں سے کام لیا جاتا تھا، رات اگر خدا کی عبادت میں بسر ہوتی تھی، تو دن ان لوگوں کی ہمدردی میں کٹتے تھے، جو مصیبت اور دکھ میں مبتلا ہوتے تھے، وقتاً فوقتاً آپ کو گنہگار لوگوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا، کبھی کبھی شادی بیاہ اور دیگر معاشرتی جلسوں میں بھی تشریف لیجاتے تھے، تو کیا یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت حضور روحانیت سے خالی ہوتے تھے، ہرگز نہیں، واقعہ یہ ہے کہ آپ کا ہر فعل روحانی حیثیت سے ہوتا تھا، اور اس اعتبار سے اگر آپ دنیاوی بادشاہ یا حاکم بن جاتے، تو روحانیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا تھا،

اگر روحانیت سے یہی مراد ہے کہ تربیت اور تمثیل کی وساطت سے انسانی مسرتوں اور اطمینانوں کے حصول میں مدد دی جائے تو بیشک انسان کا قلب اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے، دل کی سکینی اور اپنے افعال میں خاکساری و فروتنی، کہ روحانیت کی بنیاد زیادہ تر ان ہی دو نوں باتوں پر منحصر ہے، جب ان نفوس سے وقوع میں آتی ہیں، جو ان امور کے بغیر بھی اپنی زندگی عیش و مسرت سے بسر کر سکتے ہیں، تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقینی عیش و مسرت کی تلاش میں ہیں، ایسے نفوس بقدر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی سبق دے سکتے ہیں، اور بڑے بڑے گردنکشوں کو چند لمحوں میں نرم کر دیتے ہیں، مگر اس معاملے میں ایک پہلو اور بھی ہے، جب یہی اوصاف روحانی، ایک ایسے انسان میں پائے جائیں، جن کی دنیاوی حیثیت معمولی ہو تو عموماً یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ "گدا اگر تواضع کند خوے اوست"

اب حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی پر نظر ڈالئے، پہلے آپ ایک یتیم تھے، پھر اقارب و اعداکا نشانہ ظلم و ستم بنے، ترک وطن کرنا پڑا، پھر حضور ہی تھے کہ روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے اہل دنیا کی نظروں میں قوی قرار پائے لیکن کیا اس انقلاب حالت نے حضور کی طرز زندگی میں کوئی تغیر پیدا کیا، کیا طاقتور ہو جانے کے بعد جو اقتضاے

ایک انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں، وہ حضور پر بھی موثر ہوئے، کیا حضور نے نوکر اور خدمتگار سے
کام لیا، یا اپنی حفاظت کے لئے کوئی باڈی گارڈ مقرر کیا، کیا لوازمات شاہنشاہی کو اپنے پاس
آنے دیا؟ دیکھئے کہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیارات تو اس قدر کہ بڑے سے
بڑے بادشاہ کو بھی نہیں حاصل ہو سکتے، مگر آپ آخر تک دکھاوے سے متنفر، کبر سے مبرا، اور اپنے
ہمجنسوں کے ساتھ ایسے ایثار اور قربانی سے زندگی بسر کرنے والے رہے ہیں، جس کی مثال نظر نہیں
آتی، حضور بادشاہ ہیں، مگر دل کے غریب، عظیم الشان قلبی طاقت کے بانی ہیں، مگر نرم طبیعت،
اور دل کے پاک وصاف، حضور والا کے ذہن مبارک سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا، مگر یہ کہ اپنے اندر عمل
و حقیقت کی ایک پوری دعوت پنہاں رکھتا ہے، یہ ہی سچی روحانیت جو طاقت اور خوشحالی کی
صورت میں بھی بلا ادنی تغیر ویسی ہی رہتی ہے جیسی غربت اور تنہائی کی صورت میں،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسا پاکیزہ نمونہ ہماری تربیت، اور بہبودی دنیا و
عقبیٰ کے لئے قائم فرمادیا، حضور کے اخلاق نہایت سادے، پوشاک اور خوراک بالکل
معمولی، اور خود التجا کرتے ہیں کہ "اللهم احینی مسکینا الی اخرہ" آپ کی سادگی اس
حد تک پہنچی ہوی ہے کہ اپنے رفقا میں بھی معزز ہونا پسند نہیں فرماتے، اپنے خادم سے کوئی
ایسا کام نہیں لیتے جو خود نہ کر سکتے ہوں، خود ہی بازار سے سودا خرید لاتے اور ملبوس مبارک کی
مرمت کر لیتے ہیں، ہر شخص ہر وقت آپ کے پاس آسکتا، اور مل سکتا ہے، بیماروں کی عیادت
کے لئے خود ہی تشریف لے جاتے ہیں، ایک دنیا کے لئے ہمدردی آپ کے قلب مطہر میں بھری
ہوی ہے، کریمی و فیاضی کی کوئی حد نظر نہیں آتی، اور اپنی قوم کے لئے بھی آپ کی تڑپ درجہ
کمال کو پہنچی ہوی ہے، باوجود بے شمار زر و دولت کے حضور کسی شئے کو اپنا مال قرار نہیں
دیتے، آپ مکے میں بہ حیثیت ایک فاتح کے داخل ہوتے ہیں، مگر اللہ اکبر، عفو و درگزر کا کیسا
شاندار نمونہ ہے، کیا ان جانی دشمنوں سے جنھوں نے آپ پر ہر طرح کا ظلم کیا، ترک وطن پر
مجبور کیا، تمسخر کیا، تحقیر کی، انتقام لینے کا آپ کو حق نہ تھا؟ لیکن آپ نے ذاتی طور پر اپنے حاکم

ہونے کا کسی طرح اظہار نہیں کیا، اور کبھی شاہی اختیارات کا استعمال اپنی ذات کے لئے پسند نہیں فرمایا، اسی حالت میں قریش کے اُمرا آپ کے سامنے لائے جاتے ہیں، اور آپ اُن سے پوچھتے ہیں کہ تم مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ رحم کی، اور حضور فرماتے ہیں کہ اچھا تم سب آزاد ہو۔ سبحان اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم۔

حضور کی سادگی، انسانی ہمدردی، کفایت شعاری، درگزر، حلم ومتانت، مضبوطی، مصائب میں استقلال، طاقت کے موقعہ پر فروتنی اختیار کرنا، قوت کے وقت اظہار عاجزی کرنا، حیوانوں سے رحمدلی، بچوں سے الفت، عدل وانصاف پر محکم ہونا، اللہ اکبر! ایک فیاض دین و دنیا اور جان ودل کے بادشاہ تھے کہ اپنے چاروں طرف نور اور رحمت پھیلا رہے تھے، اشاعت توحید کے مقصد وحید کو اپنے سامنے رکھتے تھے اور جو کچھ تھا اس اصل کے فروعات تھے، یہ امر غور طلب ہے کہ کسی چیز کا انسان کے اندر بالقوہ موجود ہونا اس کے بالفعل ہونے پر کوئی شہادت نہیں ہوسکتا، نیز بدی سے گریز کرنے کے یہ معنے نہیں ہوسکتے کہ نیکی پر عمل کیا گیا، تاوقتیکہ نیکی کا نمونہ اور مجسمہ بنکر نہ بتایا جائے کہ حقیقی نیکی اسے کہتے ہیں، حضور سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مبارک زندگی پر نظر ڈالی جائے کہ یتیمی سے لے کر بادشاہت تک دنیاوی حیثیت سے حضور کو کتنی مختلف مسرتوں سے گزرنا پڑا مگر ہر حالت میں حضور کی طبیعت یکساں رہی، بادشاہ، مدبر، سپہ سالار، سپاہی، مقنن، تاجر، رفیق، باپ، شوہر، ہمسایہ وغیرہ زندگی کے تمام شعبے کیسے عمدہ پیرایوں میں ہمارے سامنے، ہمارے ہادی ورہنما صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہیں، اور ہم کو ہرگز کسی مزید واعظ یا ہادی کی تعلیم وتلقین کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمارے لئے سب کچھ حضور کے پاک اعمال وافعال ہی میں روشن کردیا گیا ہے،

حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گویا سراپا ایک نہایت ہی موثر تفسیر قرآن کریم کی ہے، یعنی جس خوبی اور نیکی کی تعلیم قرآن مجید کے ذریعہ سے دی گئی ہے اس کو بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے، نیز جس بدی سے بچنے کے احکام قرآن مجید میں

دئے گئے ہیں ان کی تعمیل کا مکمل نقشہ بھی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہی میں معلوم کیا جاسکتا ہے، یہ کوئی معمولی اور آسان بات نہیں، اس کی عدم موجودگی میں ہم ایک معلم کی صحیح تعلیم کا اندازہ ہرگز نہیں لگا سکتے ہیں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں ذاتی نمونہ اور تمثیل دیکھی جاسکے، وہاں تعلیم محض کو دیکھ کر نتائج عملی سے مایوس ہونا پڑتا ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں، ایسی تعلیم قابل تسلیم نہیں، فی الحقیقت جو امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے فرمائے ہیں، وہ صرف ایک ایسی ہی ہستی کے مونہہ سے نکل سکتے ہیں،

واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کو اپنی زندگی میں دنیا کے طرح طرح کے مصائب سے سابقہ نہیں پڑا، اور انقلاب و تغیرات کا سامنا نہیں ہوا، وہ بمشکل اپنی ہستی کو بطور نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرسکتا ہے، تاکہ اُس کے نقش قدم پر چل سکیں، ہر روحانی و اخلاقی صفت اپنی آفرینش کے لئے کسی نہ کسی احول کی محتاج ہے، چنانچہ کوئی شخص کسی خاص خلق سے متصف نہیں کہلا سکتا تا وقتیکہ وہ کسی موقعہ اظہار خلق میں پھنس کر خلق کا ثبوت نہ دیدے، اس قسم کی خلق کی کسوٹیوں میں سے مصیبت و بلا کی کلفتیں، اور خوشحالی و آسودگی کا اطمینان بہت اثر رکھتے ہیں، ایسے ہی موقعوں پر اس کی اخلاقی قوت کا صاف صاف امتحان ہو جاتا ہے، نسل انسان کے سرداروں میں بہت کم افراد ایسے ملیں گے، جن کے اخلاق دونوں قسم کی کسوٹیوں پر کسے گئے ہوں، اور کھرے ثابت ہوئے ہوں، مگر وہ ذات گرامی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم ہر قسم کے حالات میں سے گزری لیکن ہر حال میں ہمارے لئے ایک مکمل شمع ہدایت، اور نمونہ ثابت ہوئی، خوشحالی و حکومت کے زمانے میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم فیاضی سخاوت، حلم، عفو، درگذر وغیرہ کا نمونہ ہیں، تو مصیبت و تنگ حالی میں صبر، استقلال، امانت و دیانت اور اعتماد علی اللہ کا نہایت مکمل اظہار ہوتا ہے، اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد۔

وہ مصائب، جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے زمانہ نبوت میں جھیلنے پڑے،

اُن کو سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، ابتدا میں تو صرف آپ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
کو اور آپ کے چند قلیل پیروؤں کو ان مصائب کا سامنا کرنا پڑا، مگر رفتہ رفتہ جب حضور نے
تبلیغ توحید اور احکام الٰہی کا اعلان کیا تو تحقیر، ایذا، توہین کی کوئی حد نہ رہی حتیٰ کہ جو چند قلیل
مسلمان تھے، ان کو ملک عرب کے باہر نکلنا پڑا، اور خود آپ کو بھی آخر کار طائف کی طرف تشریف
لیجانا پڑا، وہاں بھی آپ کی ایذا رسانی کی ہر طرح کوشش کی گئی حتیٰ کہ زخمی ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
وہاں سے واپس ہوئے، واپسی کے وقت، اثنائے راہ میں آپ ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے
اور سو گئے، اسی حالت میں ایک کافر آپہنچا، اور آپ کی تلوار پر قبضہ کرکے آپ کو بیدار کیا اور
کہنے لگا کہ "اے محمد تجھے میرے ہاتھ سے اب کون بچا سکتا ہے" سبحان اللہ کیسی مستقل اور بیخوف
تھی وہ ذات مطہر جو خدا کی تقدیس و توحید کا آخری اعلان کرنے دنیا میں آئی تھی، آپ نے
نہ کچھ تامل فرمایا اور نہ ڈرے بلکہ فوراً فرمایا "میرا اللہ" اسی جواب سے کافر ایسا مرعوب ہوا کہ تلوار اس کے
ہاتھ سے گر گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھالی، اور اس سے پوچھا کہ اب تجھے میرے ہاتھ سے
کون بچا سکتا ہے، اس پر اس نے رحم کی درخواست کی، مگر پھر بھی حضور نے یہی فرمایا کہ جس خدا نے میری
حفاظت کی، وہی تم کو بھی بچانے والا ہے، وہ دشمن اس عظیم الشان اخلاقی معجزے کو دیکھکر فوراً مسلمان ہوگیا،
علاوہ بریں کئی تکلیفوں کو جو ناقابل بیان ہیں، سہنے کے بعد آخر کار کفار آپ کو
ایک مقام میں محصور کر لیتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کے ساتھ ہر قسم کا مقاطعہ
کرکے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، اور آخر کار آپ کی جان لینے کی کوشش کرتے ہیں،
اللہ آپ کی حفاظت کرتا ہے، اور آپ مدینہ کا قصد فرماتے ہیں، دشمن تعاقب کرتا ہے، اور آپ اس حال
میں کہ صرف ایک رفیق آپ کے ساتھ ہوتا ہے، ایک غار میں تشریف لیجاتے ہیں، مگر دشمن وہاں بھی
پہنچتا ہے، ان دونوں صاحبوں کو اس کی آہٹ اور بات چیت معلوم ہوتی ہے، اور آپ کا تنہا رفیق
آپ کی جان کا اندیشہ کرکے متفکر ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ "ہم صرف دو ہیں" اس وقت آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں "لا تحزن ان اللہ معنا" "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے" جل جلالہ وتعالیٰ شانہ

کیا اس سے بڑھ کر استقلال و عزم کی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟

کامل تیرہ سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے میں انواع و اقسام کی شدید اذیتیں پہنچائی جاتی رہیں مگر آپ ہمیشہ اپنے دشمنوں کے واسطے ہدایت کی دعا فرماتے رہیں، طائف سے آپ زخمی ہو کر اور تکان و کسل سے چور چور ہو کر اس حالت میں بھی مناجات کرتے ہیں "اے اللہ، میں تجھی سے اپنی حالت کا اظہار کرتا ہوں، اے اللہ میں تیرے دین کی وجہ سے تیرے بندوں کی نظروں میں ہیچ ہوں، اے خدا تو جس کا رحم بے پایاں ہے جو عاجزوں اور ناتوانوں کا خدا ہے اگر تو ناراض نہیں، تو پھر میری کوئی مصیبت مصیبت نہیں۔۔۔۔ جس طرح تو چاہے میری مشکلات کو حل کر، اے خدا تو میری قوم کو ہدایت عطا فرما اس لئے کہ وہ اس سے بے خبر ہے"۔ قلبی کیسے فیاضانہ کلمات ہیں اور جس حالت میں کہ یہ مونہہ سے نکل رہے ہیں، اسکی کیسی وسعت کی شہادت دے رہے ہیں، اور پھر بھی دشمن ہیں کہ جن پر بعد کو آپ پورا پورا غلبہ اور فتح پاتے ہیں مگر ان کو معاف کر دیتے ہیں، اور اس طرح عفو کا پورا اور صحیح نمونہ ہمارے لئے سامنے آجاتا ہے، یعنے جب دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم مکہ میں داخل ہوتے ہیں، اور وہی دکھ دینے والے ظالم مغلوب ہو کر آپ کے سامنے لائے جاتے ہیں، وہی شقی بدبخت کفار، جنھوں نے کامل تیرہ برس تک آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کے دکھ دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا اور اب وہی ظالم آپ کے سامنے پیش ہو کر بجز اعتراف جرم کے چارہ نہیں دیکھتے اگر آپ اس وقت ان کو گردن زدنی قرار دیتے یا غلام بنا لیتے، تو دنیا کا کوئی قانون آپ کو ملزم نہیں ٹھیرا سکتا تھا، ان کو شدید سے شدید عقوبت دینا بھی بالکل جائز اور مقتضائے سیاست ہوتا، لیکن اس ارحم الراحمین کی صفت عفو تو اس کی طالب تھی کہ اس کا ایک مطلق صحیح بھی منجملہ دیگر مطلقین کے اہل دنیا کے روبرو آجائے اس نے مختلف انبیا کو اپنے صفات کا مظہر بنا کر دنیا میں بھیجا، آنحضرت خاتم النبیین تھے، پس لازمی تھا کہ آپ کامل ترین مظہر ہوتے، اور وہ اوصاف ربانی جنھوں نے صورت کاملہ انسانی کی صورت میں اب تک نشوونما حاصل نہیں کی تھی وہ تکمیل کو پہنچتے، چنانچہ آپکے دشمن آپکے سامنے مغلوب ہو آتے ہیں تو آپسے عرض کرتے ہیں کہ "ہمارے جرموں کا خیال نہ کیجیے، بلکہ اپنے کرم پر نظر فرمائیے کیونکہ حضور کریم ابن کریم ہیں،" اور آپ سب کو معاف کر دیتے ہیں،

حجاز کے فرنگی سیّاح

حاجی عبداللہ عرف کیپٹن سر رچرڈ فریڈرک برٹن

(از مولوی سید علی شبیر صاحب مترجم عثمانیہ مدظلہ العالی)

اس مبارک اشاعت میں حجاز کے فرنگی سیاح کے سلسلے کو بھی جگہ دی جا رہی ہے، اگرچہ کہ ترتیب کے لحاظ سے اس سیاح سے پہلے، اور دو تین فرنگی سیاحوں کا حال طبع ہونا چاہئے تھا لیکن اول تو "برٹن" بہمہ وجوہ دوسرے تمام فرنگی سیاحوں پر فوقیت رکھتا ہے، اور پھر ہمارے فاضل مضمون نگار صاحب نے روضۂ نبوی کے متعلق مغربی بے سروپا مہملات کا نہایت قاطع اور مسکت جواب دیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بلا لحاظ ترتیب، اس ماہ مقدس ربیع الاول کے پرچے میں "برٹن" کے حالات کو جگہ دی جائے .... (ترجمان)

حجاز کے فرنگی سیاحوں میں "برٹن" سب سے زیادہ مشہور ہے، یہ زبردست سیاح و مصنف جس کے علم و فضل کے ڈنکے یورپ میں بج رہے ہیں، اور جس کی عربی و فارسی قابلیت اور اسلامی واقفیت پر اہل یورپ ناز کرتے ہیں، ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۲۱ء کو بمقام ہرٹفورڈ شائر[1] پیدا ہوا تھا، اس کا لڑکپن فرانس و اٹلی میں گزرا جہاں کچھ یوں ہی بے قاعدہ طور پر اس کی تعلیم ہوئی، اس کے بعد ٹرنٹی کالج آکسفورڈ[2] میں تعلیم پائی اور یہیں اس نے عربی زبان بھی شروع کی، ۱۸۴۲ء میں وہ اٹھارھویں بمبئی "پلٹن" میں لفٹنٹی کے عہدے پر مامور ہو کر ہندوستان آیا، اور ریاست بڑودہ میں متعین ہوا، یہاں اس نے کپتانی تک ترقی پائی، لیکن یہ ملازمت اس کو پسند نہ تھی،

---

[1] ہرٹفورڈ شائر صوبہ لندن کا ایک ضلع ہے، اس کی آبادی تخمیناً تین لاکھ ہے،
[2] انگلستان کا ایک شہر ہے، یہاں کی یونیورسٹی اور ٹرنٹی کالج نہایت مشہور ہے۔

اس لئے فوجی زندگی سے اکتا کر اس نے محکمہ پیمایش میں تبادلہ کرا لیا اور اس طرح اس کو سندھ کی سیر اور مختلف زبانوں کے سیکھنے کا موقع مل گیا، ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب میں انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی ہو رہی تھی اس نے اس جنگ میں ترجمان مقرر ہونے کے لئے درخواست کی، مگر وہ نامنظور ہو گئی اور اس سے "برٹن" کی اس قدر دل شکنی ہوی کہ وہ تین سال کی رخصت غیر معمولی حاصل کر کے ولایت چلا گیا، ۱۸۵۱ء تک اہل یورپ کو مشرقی و وسطی عرب کے حالات کافی طور پر معلوم نہ تھے "برٹن" کی طبیعت بہت ہی متلاشی واقع ہوی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسا کام کرے جو اس کے ملک و قوم کے لئے مفید ہو، اس لئے اب اس نے سفر حجاز کی ٹھان لی اور لندن کی "رایل جیوگرفیکل سوسائٹی"[1] سے زاد راہ کا بندوبست کر کے، اپریل ۱۸۵۳ء میں وہ انگلستان سے مصر روانہ ہوا، اسلامی طرز معاشرت اور عربی سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس نے ڈھائی تین مہینے قاہرہ میں گزارے اور وہاں کے ایک مشہور عالم شیخ محمد العطار[2] کا شاگرد ہو گیا، "برٹن" نے ان سے شافعی فقہ کی تعلیم حاصل کی، بقول "برٹن" اس میں مصلحت یہ تھی کہ فقہ شافعی بہ مقابلہ دوسرے مذاہب کے آسان ہے، نیز شیعوں کے مسایل اس فقہ کے مسائل سے ملتے جلتے ہیں، جن سے "برٹن" ایرانیوں کی صحبت سے بہت واقف ہو گیا تھا، "برٹن" نے اول اپنے تئیں مرزا عبداللہ ظاہر کیا تھا لیکن حاجی ولی عرف ڈاکٹر ویلن[3] کی رائے سے اس نے اپنا نام عبداللہ خاں رکھ لیا، اور جہاں کہیں پوچھ گچھ ہوئی اس نے اپنے تئیں رنگون کا رہنے والا سنی المذہب شافعی مشرب پٹھان بتا دیا، "برٹن" کو علم طب میں بھی دخل تھا اس وجہ سے لوگ اس کو حکیم عبداللہ خاں کہنے لگے تھے، حج کے ارادے سے چند مصریوں کے ساتھ "برٹن"

---

[1] لندن کی ایک مشہور کمیٹی تھی جس کے مقاصد و اغراض دنیا کے نامعلوم حصوں کے حالات معلوم کرنا تھے،

[2] یہ شخص کسی زمانے میں سرکاری خطیب تھا ان دنوں محلہ جمالیہ واقع قاہرہ میں اس کی عطاری کی دکان تھی،

[3] ڈاکٹر ویلن ایک روسی سیاح تھا جس نے ۱۸۴۵ء میں عرب کے بعض حصوں کی سیاحت کی تھی اور حج بھی کر آیا تھا مگر اس نے اپنا سفرنامہ نہیں لکھا اس وجہ سے ہم اس کا ذکر آیندہ متفرق سیاحان حجاز میں کریں گے،

قاہرہ سے روانہ ہوا اور سوئز تک اونٹوں پر سفر کیا، یہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ینبوع داخل ہوا، پھر حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا، اس کے بعد شامی قافلے کے ہمراہ مکے گیا اور حج میں شریک ہو کر جدے کی راہ سے انگلستان واپس ہو گیا،

۱۸۶۱ء میں برٹن نے محکمہ خارجہ کی ملازمت اختیار کی اور امریکہ، افریقہ، ایشیا و یورپ کے مختلف ممالک میں وہ انگریزی سفارت کے عہدے پر فائز رہا، آخر عمر میں اٹھارہ برس تک سلطنت آسٹریا کے بندرگاہ "ٹریسٹ"[۱] میں قونصل کے عہدے پر مامور رہ کر وہیں ستر برس کی عمر میں ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو انتقال کیا، اس کی لاش کو کافور وغیرہ لگا کر انگلستان لے گئے اور وہاں قصبہ مارٹلیک[۲] میں سپرد خاک کیا، برٹن کی عربی سیاحت کی یادگار میں اس کی قبر پر سنگ مرمر کا ایک عربی وضع کا خیمہ اس کی بیوی آئسبل برٹن نے بنوا دیا اور اب یہ سیاح عرب اس میں سو رہا ہے،

اسٹینلی لین پول[۳] جس نے برٹن کے سفرنامہ حجاز مطبوعہ ۱۸۹۸ء پر دیباچہ لکھا ہے تحریر کرتا ہے کہ:

"وہ اٹھارہ زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، انگریزی اس کی مادری زبان تھی، اس کے علاوہ فرانسیسی، اطالی، اردو، فارسی، عربی، گجراتی، مرہٹی، ملتانی، پنجابی و سندھی زبان وہ اس طرح بولتا تھا جیسے کوئی مادری زبان بولتا ہے، ۱۸۴۲ء میں رخصت بیاری پر جب وہ بغرض تبدیل آب و ہوا دکن گیا تھا تو وہاں اس نے تامل و تلنگی وغیرہ زبانیں سیکھ لی تھیں، ان کے سوا ترکی، سنسکرت، پشتو، اور ارمنی زبان بھی اچھی طرح بول سکتا تھا"

مذکورہ بالا بیان بہت ہی مبالغہ آمیز ہے، اہل یورپ اپنی اصطلاح میں جس کو زبان جاننا کہتے ہیں ہم اس کو زبان بگاڑنا سمجھتے ہیں، یورپ میں برٹن کو عربی کا بہت بڑا محقق

---

[۱] ٹریسٹ آسٹریا کا بندرگاہ بڑی تجارت کی جگہ ہے، عمارتی لکڑی، آرائشی سامان اور مخمل و شکر یہاں کی درآمد ہے،
[۲] مارٹلیک دریائے ٹیمز کے کنارے لندن سے جانب غرب و جنوب آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے یہاں اکثر مشہور آدمیوں کی قبریں ہیں۔
[۳] یہ ایک مشہور مورخ اور عالم آثار قدیمہ ہے ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوا تھا، عربی کا ماہر سمجھا جاتا ہے ۱۹۰۴ء تک ٹرنٹی کالج ڈبلن میں عربی کا پروفیسر رہا ہے، اس کی تصنیفات میں مورس ان اسپین (تاریخ اسپین)، آرٹ آف سراسینز (مسلمانوں کے علوم و فنون) عصر متوسط میں اور قاہرہ کی کہانی مشہور ہیں،

واہمہ خیال کیا جاتا ہی مگر ہم جیسا کہ آگے ثابت کرینگے وہ عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اگرچہ اُس کے سفر نامہ حجاز میں بہت سے محققانہ و عالمانہ مضامین ہیں مگر بعض باتیں ایسی بھی ہیں

جن سے اُس کی قابلیت و تحقیق پر پانی پھر گیا چنانچہ مضمون ہذا ایک اسی قسم کی غلطی کی اصلاح

کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے، برٹن کی تصنیفات بکثرت ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

مغربی افریقہ کا سفر، کمرونس[1] کے حالات، شاہ دھومی[2] کی خدمت میں وفد، گوریلا[3] کی سرزمین،

کانگو[4] کا راستہ، مدیان[5] کی سنہری کانیں، سرزمین مدیان، ترجمہ الف لیلہ، زنجبار[6] اور ملک

شام کا نامعلوم حصہ، ان کتابوں میں سے اکثر دو دو جلدوں میں ہیں، برٹن کا ترجمہ الف لیلہ

نہایت ہی دلکش و سلیس مانا گیا ہی جس پر اُس نے نہایت بیش بہا حاشیہ چڑھایا ہی، برٹن کی

سوانح عمری اس کی بیوی "آبل برٹن" نے دو جلدوں میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ تحریر کی ہی،

---

[1] کمرونس افریقہ کا مشہور پہاڑ ہے، کبھی کبھی آتش فشانی بھی کرتا ہے، جنگ یورپ سے قبل یہ جرمنی کا علاقہ تھا اب وہاں انگلستان و فرانس کا قبضہ ہے،

[2] دھومی مغربی افریقہ میں فرانسیسیوں کا ایک ملک ہے،

[3] مغربی افریقہ کے بعض مقامات گمبیا وغیرہ میں ایک قسم کا بہت بڑا بندر ہوتا ہے اُسے گوریلا کہتے ہیں،

[4] کانگو افریقہ کا بہت بڑا دریا ہے، اس میں افریقہ کے تمام دریاؤں سے زیادہ پانی ہے اس کے تہ میں گھنے جنگل ہیں جن میں ربڑ کے درخت، تارپین کا تیل، اور ہاتھی دانت پایا جاتا ہی یہاں بلجیم کی حکومت ہی،

[5] مدین یا مدیان بحر احمر کے مشرقی ساحل پر ایک پرانی بستی اور بڑی تجارت گاہ تھی یہیں کے تاجروں کے قافلے کے ہاتھ حضرت یوسفؑ فروخت کئے گئے تھے (قرآن شریف سورۂ قصص و توریت کتاب پیدایش باب ۳۷) حضرت موسٰی بھی فرعون کے پاس سے بھاگ کر یہاں پہنچے تھے اور اسی مقام پر شعیب کی لڑکی صفورہ سے شادی بھی کی تھی (توریت خروج باب ۲ اس شہر کے کھنڈر اب تک موجود ہیں، ابو الفدا لکھتا ہے ۷۳۲ھ تک وہ کنواں جس پر حضرت موسٰی نے شعیب کی بکریوں کو پانی پلایا تھا، زیارتگاہ تھا، واضح ہو کہ اس مدیان کو مدائن صالح نہ سمجھ لینا چاہیے جو علاقہ شام میں حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن ہی اور جہاں حضرت صالح کے زمانہ کی صدہا عمارتیں ویران پڑی ہیں، عراق عرب میں نوشیروان کا پایہ تخت مدین بھی اس کے علاوہ تھا، جہاں مشہور محل کاخ کسریٰ کے کھنڈر اب تک موجود ہیں جن کے مرثیہ میں خاقانی ان کی زبان حال سے کہتا ہے:

ما بارگہ دادیم ایں رفت ستم بر ما   بر کاخ ستمگاراں آید چہ رود خذلا

[6] مشرقی افریقہ میں انگریزی علاقہ کا ایک بندرگاہ اور تجارت کا مرکز ہے، لونگ کی پیداوار کے لئے مشہور ہی برائے نام یہاں ایک مسلمان سلطان بھی ہی،

برٹن نے ۱۸۶۱ء میں چالیس برس کی عمر میں اس عورت سے شادی کی تھی، سوانح عمری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس عورت سے بڑھ کر کسی عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی، برٹن کے ساتھ اس کی بیوی کو جو عقیدت ہے، وہ تعظیم سے گزر کر عبادت و پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے، اس وجہ سے برٹن کی سوانح عمری میں مبالغہ کا ایک گہرا رنگ چڑھ گیا ہے، برٹن کا سفرنامہ حجاز جو ہمارے موضوع کا ماخذ ہے، تین حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول کا نام المصر، حصہ دوم کا نام المدینہ اور حصہ سوم کا المکہ ہے، یہ سفرنامہ کئی مرتبہ شایع ہو چکا ہے، آخری مرتبہ ۱۸۹۳ء میں "جارج بل اینڈ سنز لندن" نے اس کو دو جلدوں میں مع تصاویر و نقشہ جات طبع کرایا، اور یہی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے،

۱۹۰۲ء میں اس درویش نے اردو میں اس سفرنامے کا ترجمہ شروع کیا تھا، اور تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ کر بھی ڈالا تھا، مگر اس وقت اشاعت کا انتظام چونکہ ہو نہیں سکتا تھا، اس لئے کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا، ۱۹۱۰ء میں دفتر اخبار "وطن" لاہور کی کتب مطبوعہ کی فہرست میں سفرنامہ برٹن کے ترجمہ کا اشتہار شایع ہوا، جسے دیکھ کر میں اس کے ترجمہ کے خیال سے دست بردار ہوگیا، دفتر وطن کے اس ترجمے کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ صرف مدینہ منورہ کے حالات کا ترجمہ ہے، جو سفر دار المصطفےٰ کے نام سے چھاپا گیا ہے، اس کے مترجم مولوی محمد انشاء اللہ صاحب اڈیٹر اخبار وطن اور مولوی مصباح الدین صاحب ہیں، زبان کے لحاظ سے اس کو پنجابی اردو کہا جا سکتا ہے، اکثر عربی الفاظ و اصطلاحات و مقامات وغیرہ کے نام بھی غلط لکھ دئے ہیں، بعض جگہ ترجمہ بھی غلط کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بعض فاش غلطیاں ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برٹن کے اعتراضات و نکتہ چینی اور خصوصاً ان شبہات کی جو اس نے آنحضرت کے روضہ کی نسبت کئے ہیں، اور اس کو ایک فرضی قبر بیان کیا ہے، کافی تردید بھی نہیں کی گئی، بلکہ برٹن نے شبہات مذکورہ کے ضمن میں سمہودی، قلقشندی وغیرہ کے جو غلط حوالے دئے ہیں، اُن کا اصل عبارت سے مقابلہ تک نہیں کیا، اڈیٹر صاحب موصوف نے سفرنامہ برٹن کے

باقی دو حصوں کے ترجمے کا وعدہ بھی دیباچے میں فرمایا ہے، اس لئے اُن حصوں کی اشاعت بھی دوسرے شخص کے لئے اخلاقاً ممنوع ہوگئی، قصہ مختصر اس طرح میں نے اس سفرنامے کے ترجمے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر کے ترجمہ شدہ حصے کو کسی مناسب مقام پر دفن کردینے کے لئے رکھ چھوڑا ہے اللہ بس باقی ہوس،

اس موقع پر برٹن کے بھیس بدلنے کے متعلق چند سطریں لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا، مولوی محمد انشاء اللہ صاحب اپنے ترجمہ دار المصطفیٰ کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کپتان برٹن نے اس اہم و پرخطر سیاحت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اور لطف یہ ہو کہ اس کی کوئی اصلی قومیت شناخت نہ کرسکا"

مولوی صاحب موصوف نے اس رائے میں مبالغہ سے کام لیا ہے، اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس مصلحت سے انھوں نے حقیقت کا اخفا فرمایا، برٹن کی اصلیت و قومیت کے متعلق جو شکوک سفر حجاز میں اُس پر کئے گئے، اُن کے بارے میں وہ خود اپنے سفرنامے میں قاہرہ سے سوئز تک کے حالات میں لکھتا ہے:۔

"باوجود ہر قسم کی ہوشیاری کے کئی مرتبہ مجھ پر شبہ ہوا، اور ایک دفعہ تو مجھ سے بھی غلطی ہوگئی، میں نے اپنے قافلے کے حاجیوں کو ایک آلہ پیمائش دکھایا جس سے وہ لوگ چونک گئے"

اس سے بڑھ کر اور ثبوت ملاحظہ ہو:۔

برٹن اپنے ملازم و مطوف محمد البسونی[۱] کی نسبت کہتا ہے:۔

"جب وہ نماز پڑھتا تو میرے پیچھے کھڑا ہوتا، اور اس طرح وہ اس شک کا جو میری جانب سے اُس کے دل میں تھا ثبوت دیا کرتا تھا، اس کو ابتدا ہی سے مجھ پر کم سے کم

---

[۱] محمد البسونی مکے کا رہنے والا ایک لڑکا تھا، برٹن نے قاہرہ میں اس سے احرام خریدا تھا، قاہرہ سے روانگی کے بعد نخلستان سوئز میں اس کو ملازم رکھ لیا تھا، مکہ معظمہ میں اسی کے مکان پر قیام کیا تھا، اور اسی کو اپنا مطوف مقرر کیا تھا،

کافر ہونے کا شبہ تھا۔" اہل حجاز کی اصطلاح میں کافر سے ہمیشہ انگریز مراد ہوتے ہے، برکھارٹ و برٹن کے سفرناموں میں جا بجا اس کی تفصیل موجود ہے، جدے کے حالات میں برٹن اسی لڑکے محمد کی نسبت لکھتا ہے :-

"وہ بہت سرد مہری کے ساتھ مجھ سے رخصت ہو کر چلا گیا اور اس کا سبب چند روز بعد میرے ملازم شیخ نور نے مجھ سے بیان کیا اس لڑکے (محمد) کو میں اپنے ساتھ جہاز پر لے گیا تھا، وہاں اس کے دل میں بہت بڑا شبہ ہو گیا اس نے شیخ نور سے کہا، اب میں سمجھا تمہارا آقا ہندوستان کا صاحب لوگ ہے، وہ ہماری ڈاڑھیوں پر ہنس گیا"

اس کے علاوہ برٹن کے سفرنامے سے ظاہر ہے کہ اور بھی کئی مرتبہ اس پر شبہات ہوئے تھے[1] برٹن کا راز افشا نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قافلے کے ہمراہیوں کے ساتھ بہت داد و دہش کرتا تھا اور خصوصاً محمد البسونی کو تو اس نے اپنی تھیلی کا مالک بنا رکھا تھا، علاوہ اس کے برٹن نے اس سفر میں اپنے تئیں ہندوستانی ظاہر کیا اور عربوں کے ساتھ حج و زیارت کی اور انھیں کے پاس قیام کیا، ان کے سامنے اس کی ہندوستانیت کیا ثابت ہو سکتی تھی، اب رہا اس کا پنجابی ملازم شیخ نور، وہ اردو کیا جانے زیادہ سے زیادہ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ رنگون میں ایسی ہی اردو بولتے ہونگے، ہاں اگر وہ ہندوستانیوں کے ساتھ مکہ و مدینہ کی سیر کرتا تو ایک منٹ میں اس کی قلعی کھل جاتی؛ پھر بھی اس کے عرب ملازم محمد نے تاڑ ہی لیا تھا کہ یہ ہندوستان کا صاحب ہے مگر یہ "تاریعوب" یعنی روپے کا کرشمہ تھا،

---

[1] کتاب "کرسچنز ایٹ مکہ" (اکہ میں پیروان مسیح) جو ہمارے مضمون "حجاز کے فرنگی سیاح" کے گیارہ سال بعد ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی ہے اس کا مولف "لائف آف برٹن" (بضمن حالات برٹن) حاشیہ میں لکھتا ہے کہ "مدینہ و مکہ کی راہ میں ایک شخص نے برٹن کو تاڑ لیا تھا مگر خوش قسمتی سے وہ دوسرے دن صبح خنجر سے مقتول پایا گیا یعنے برٹن نے اس کا کام تمام کر دیا، اور یہ حکایت لندن میں عام طور پر مشہور تھی، چنانچہ برٹن کی شادی کے وقت اس کے ایک دوست ڈاکٹر نے اس طرح علیک سلیک کی،
ڈاکٹر :- کسی آدمی کو قتل کرنے کے بعد تمہارا مزاج کیسا رہتا ہے؟
برٹن :- نہایت بشاش! مزاج شریف ڈاکٹر صاحب!

کہ اس کو گرفتار کرایا، اس میں شک نہیں کہ برٹن مسلمانوں کے رسم و رواج سے بہت کچھ واقفیت رکھتا تھا فارسی میں اس کی قابلیت معقول تھی، اس کی عربی دانی کے متعلق اگرچہ یورپ میں بہت کچھ ڈنکے بج رہے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ وہ عربی عبارت کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا، البتہ مسلمانوں کے تاریخی حالات سے اس کو بہت آگاہی تھی، اور بھیس بدلنے میں وہ بڑا مشاق تھا، ہندوستان کے دوران قیام میں کئی مرتبہ علاقہ سندھ میں وہ اسی قسم کے بھیس بدل چکا تھا[1] اور ایرانیوں اور افغانوں کے عادات و خصائل کی مشق بھی اُس نے کر لی تھی، لیڈی برٹن نے اس کے روپ بھرنے کے متعلق جو دلچسپ ریمارک اپنی مولفہ سوانح عمری میں کیا ہے، ہم اس کا ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں :-

"کندھوں پر زلفیں لٹکائے سینہ پر لمبی داڑھی لہراتی ہوئی، چہرہ اور ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے، آپ کا خادم مرزا عبداللہ بوشہری بڑے بڑے کھیل کھیل چکا ہے، کبھی وہ بزاز بن جاتا اور ململ، خاصہ، چھینٹ کی پوٹلی بغل میں مارے گلی کوچوں میں پھیری لگاتا، اور اپنا سامان دکھانے کے لئے زنانخانے میں بھی بلا لیا جاتا، کبھی وہ ایک امیر سوداگر کا بھیس بنا کر کسی گاؤں کے قریب ڈیرے ڈالتا اور مسلمانوں کا لباس پہنے، ہاتھ میں نیزہ لئے کمر میں پستول لگائے باہر نکلتا، ڈرپوک گاؤں والے اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور وہ اُن سے مختلف قسم کی معلومات حاصل کرتا، کبھی وہ کوئی دکان کرایہ پر لیتا، اور چمکتی ہوئی کھجوریں، گڑ، تمباکو، سونٹھ، تیل، مٹھائی، بیچنے لگتا، کبھی مرزا کسی مسجد میں جا اترتا اور اُن طالب علموں کے ساتھ جو مسجد کے خاک آلود فرش پر لیٹے عربی دینیات کی پھٹی پرانی ملی دلی کتابیں مٹی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے پڑھا کرتے تھے رات گزارتا، کبھی وہ ریشائل سر گھٹے، اندھی آنکھوں والے ملاؤں سے

[1] علاقہ سندھ میں برٹن نے مرزا عبداللہ بوشہری کے نام سے سیاحت کی تھی،

بحث کرتا، کبھی وہ بھلے مانسوں کے سے سفید کپڑے پہنے گانے بجانے کی محفل میں جا گھستا، اور "السلام علیکم" کہہ کر بے تکلف بیٹھ جاتا، کبھی وہ افیمیوں اور گانجہ پینے والوں کی صحبت میں وقت گزارتا، کبھی وہ مشاطہ عورتوں سے جو مسلمانوں میں شادی بیاہ کراتی ہیں، رسم و رواج کے متعلق ضروری باتیں پوچھتا، اللہ اکبر کیا کیا تماشے اس نے دیکھے، کیا کیا واقعات اس پر گزرے، اگر وہ تفصیل کے ساتھ بیان بھی کرتا تو کسی کو یقین نہ آتا۔"

اب ہم اس کے سفرنامے پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں، اس کا پہلا حصہ مصر کے متعلق ہے، اور قاہرہ سے ینبوع[1] تک کے حالات اس میں درج ہیں، چونکہ برٹن سے پیشتر اکثر سیاحوں نے مصر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اس لئے برٹن نے اُن سے قطع نظر کرکے صرف قاہرہ کے مسافر خانوں کی زندگی اور رمضان کا سماں دکھایا ہے، ایک باب مسجد کے عنوان سے ہے جس میں مساجد کی وضع و قطع کی تاریخ لکھی ہے، اس سے مسلمانوں کے مذاق فن تعمیر پر روشنی پڑتی ہے، ایک باب میں قاہرہ سے سوئز تک رستے کے حالات ہیں، دوسرے حصے میں مدینہ منورہ کے تاریخی و معاشرتی ہر قسم کے حالات نہایت وضاحت سے تحریر کئے ہیں، اس حصے میں بجز چشم دید حالات کے، باقی تمام تاریخی حالات کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب[2] مصنفہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی سے لفظ بہ لفظ اخذ کئے ہیں، برٹن سے قبل کسی یورپین سیاح نے مدینہ منورہ کے حالات ایسی شرح و بسط کے ساتھ نہیں لکھے تھے، ان حالات کے متعلق جو نوٹ اس نے تحریر کئے ہیں، وہ بھی اسی کا حصہ ہے،

تیسرے حصے میں مکہ معظمہ کے حالات، مناسک حج اور مقامات متبرکہ و جدے کے حالات و واقعات ہیں، اس حصے میں تاریخی حالات کتاب تاریخ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام مولفہ قطب الدین[3] مکی سے

---

[1] ینبوع ساحل بحر احمر پر مدینہ منورہ کا مشہور بندرگاہ ہے، جدے سے جہاز میں جائیں تو ایک دن میں ینبوع پہنچتے ہیں، یہاں سے مدینہ منورہ پانچ منزل ہے،

[2] کتاب جذب القلوب سنہ ١٠٠١ ہجری میں تالیف ہوئی ہے، محدث ممدوح کی وفات ١٠٥٢ ہجری میں ہوئی،

[3] فقیہ قطب الدین مکے کے قاضی تھے، ان کی تاریخ جو ٩٨٥ ہجری میں تالیف ہوئی نہایت معتبر کتاب ہے،

لئے ہیں، اور بیت اللہ کے مفصل حالات سفر نامہ برکھارٹ سے نقل کئے ہیں، برٹن نے مکہ معظمہ کے حالات اُس وضاحت سے نہیں لکھے جیسے کہ مدینہ منورہ کے، اور حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے حالات برکھارٹ سے بہتر آج تک کسی مسلمان یا عیسائی سیاح کے سفرنامے میں نظر سے نہیں گزرے، برٹن نے اپنے سفرنامے میں عموماً واقعات کا اظہار بے کم و کاست کیا ہے لیکن بعض بعض مقامات پر اس کا فطرتی قومی تعصب بے اختیار ظاہر ہوگیا ہے، اور مدینے کے حالات میں تو زیارت مرقد منورہ کا ذکر کرتا ہوا وہ تحقیقات کے نشے میں اس قدر بے خود و سرشار ہوگیا کہ اس کی عربی کی کم استعدادی پر جو زبردست ملمع چڑھا ہوا تھا وہ اس نے سب کھرچ کر پھینک دیا اور آنحضرت کی قبر مطہر کو ایک فرضی قبر بیان کر کے اپنی قابلیت کو بٹہ لگالیا، اکثر غیر مسلم ماہرین علوم شرقیہ کی عادت دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ یا تو ناقابلیت کی وجہ سے، یا تعصب کے باعث، یا بغض اس نیت سے کہ اُن کی کتاب کثر اکثر فروخت ہو جائے، اسلام و اہل اسلام کے صحیح حالات لکھتے لکھتے بعض واقعات ایسے بھی تحریر کر جاتے ہیں جو اُن کے اہل ملک کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں[1] برٹن کا آنحضرت کی قبر شریف کے متعلق شبہ کرنا بھی کم از کم متذکرہ بالا تینوں وجوہ میں سے پہلی اور تیسری وجہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے، اس وقت ہم برٹن کی دوسری لغزشوں سے قطع نظر کر کے صرف انھیں شبہات کی تنقیح و تنقید کرتے ہیں جن کو اس نے قبر رسول اللہ صلعم کے فرضی ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے، ہم برٹن کے وجوہ شبہ کو جو اس نے تقریباً ایک جگہ لکھے ہیں علیحدہ علیحدہ کر کے

---

[1] برٹن کی دیکھا دیکھی بلکہ اسی کے اعتراضات لے کر اور ان میں کچھ بے تکی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے امریکن پادری زویمر صاحب نے بھی اپنی کتاب حالات عراق و عرب و عمان میں، جو "کریڈل آف اسلام" کے نام سے ۱۹۰۰ء میں شایع ہوئی ہے آنحضرت کے مرقد مبارک کو اپنے معمولی پادریانہ لہجے میں فرضی قبر بیان کیا ہے، آج کل ۱۹۲۴ء میں پادری صاحب موصوف حیدر آباد آئے ہوئے ہیں، اور عربی کتابوں کا حوالہ دے کر جابجا لکچر دے رہے ہیں، جن سے عام طور پر لوگ ان کو بڑی معلومات کا آدمی سمجھ رہے ہیں، مگر ان کی کتاب مذکور "کریڈل آف اسلام" یعنی گہوارۂ اسلام ملاحظہ فرمالی جائے تو ان اعتراضات سے جو اسلام و بانئی اسلام پر پادری صاحب نے کئے ہیں ان کی سادی قابلیت آئینہ ہو جائے گی، قبر مطہرہ کی نسبت پادری صاحب نے جو خامہ فرسائی فرمائی ہے وہ ہم اپنے مضمون کی مناسبت سے یہاں ترجمہ کر کے نقل کرتے ہیں، اور نہایت اختصار

ہر اعتراض کا جواب اس کے نیچے درج کرتے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ساتھ ان پر کچھ ریمارکس بھی کر دیتے ہیں:۔

(۱) آنحضرت کی وفات کی خبر سن کر ایک ہل چل مچ گئی اور حضرت عمر نے دھمکی دی کہ جو اس کا یقین کرے گا قتل کیا جائے گا، کیا یہ ممکن ہو کہ تجہیز و تکفین خاموشی سے عمل میں آئی ہو؟ (تجہیز و تکفین خاموشی کے ساتھ ہو ہی گئی، کتب تاریخ و احادیث شاہد ہیں، توضیحاً برٹن کے اعتراض نمبر (۲) کا جواب ملاحظہ ہو)

(۲) وفات کے بعد بھی خلافت کے متعلق بہت جھگڑا ہوا اور بقول شیعوں کے حضرت علیؓ و فاطمہؓ کا مکان جو موجودہ قبر شریف کے متصل تھا اس کو آگ لگانے کی دھمکی دی گئی (برٹن کے اعتراض نمبر (۲) کا جواب ملاحظہ ہو)

(۳) متقدمین مسلمان قبر (شریف) کی اس قدر تعظیم نہیں کرتے تھے جیسے کہ متاخرین، جبکہ روایتوں نے آنحضرت کو عام انسانی درجے سے بہت بالا تر پہنچا دیا ہے، اگلے مسلمان قبر (شریف) کی ٹھیک ٹھیک جگہ سے بھی ناواقف تھے (اس کا تفصیلی جواب برٹن کے اعتراض نمبر (۳) کے جواب میں ملاحظہ ہو جس سے ثابت ہو کہ اگلے مسلمان بھی قبر شریف کی شرعی تعظیم کیا کرتے تھے اور صلوٰۃ و سلام کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے، سنت الٰہی ہمیشہ سے اسی پر جاری ہے کہ ہر پیغمبر کی وفات کے بعد اس کی تعظیم زیادہ ہوا کرتی ہے چنانچہ جناب مسیح کے سب حواری آپ کو سپاہیوں کے ہاتھ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہوداہ نامی حواری نے تیس روپیہ میں گرفتار کرا کے صلیب پر ہی چڑھوا دیا، یہ اگلے عیسائی جناب مسیح کی تعظیم کیا کرتے تھے، متاخرین عیسائی صلیب کی لکڑی کے لئے لاکھوں کٹ مرے)

(۴) اوائل زمانے میں پیغمبر صاحب کی قبر کی شکل معلوم نہ تھی اور نہ وہ احادیث میں بیان کی گئی ہے، اسی وجہ سے ہم بعض ممالک میں ڈھلوان قبریں دیکھتے ہیں اور بعض جگہ مسطح (برٹن کے اعتراض نمبر ۴ کا جواب ملاحظہ ہو)

(۵) آنحضرت کے دفن کے متعلق مسلمان علما کے اقوال مختلف ہیں (برٹن کے اعتراض نمبر ۶ کا جواب ملاحظہ ہو)

(۶) روضہ کئی صدیوں تک شیعوں کی زیر نگرانی رہا ہے اور (حضرت) ابوبکر و عمر کی دشمنی کی وجہ سے یہ بات ان کی دلچسپی کی تھی کہ انھوں نے جسم کو منتقل کر دیا ہو (برٹن کے اعتراض نمبر (۸) کا جواب ملاحظہ ہو)

(۷) (قبر شریف) کی موجودہ حالت شبہ انگیز ہے، حجرے کی نگرانی خدام بہت سختی سے کرتے ہیں اور اس کے اندر کسی کو داخل ہونے نہیں دیتے (برٹن کے اعتراض نمبر (۶) کا جواب ملاحظہ ہو)

(۸) اندھا کر دینے والی روشنی جو قبر کو گھیرے ہوئے ہے اس کا قصہ عیب کے چھپانے کے لئے ایک گھڑی ہوئی کہانی معلوم ہوتی ہے (برٹن کے اعتراض نمبر ۹ کا جواب ملاحظہ ہو)

(۹) محمد الحلبی شیخ العلماء دمشق نے برٹن کو یقین دلایا تھا کہ اس دروازے میں سے جس میں ہو کر حجرہ کے اندر پہنچتے ہیں خدام نے ان کو اندر جانے کی اجازت دیدی تھی مگر انھوں نے وہاں قبر کا کوئی نشان نہیں دیکھا (حجرہ شریف کے اندر داخل ہونے کے لئے تو کوئی دروازہ ہی نہیں ہے، ہاں بیرونی جالی کے اندر داخل ہونے کیلئے چار دروازے ہیں اور خدام بعض معتبر و متمول اشخاص کو جالی کے اندر جانے کی اجازت دے دیتے ہیں مگر وہاں قبر کا نشان کیا دکھائی دے سکتا ہے؟)

(۱۰) مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ ۵۵۷ھ ہجری میں آنحضرت اور ان کے دونوں صحابہ کے اجسام منتقل کر دینے کی

اعتراض نمبر (۱)

برٹن کہتا ہے " اگرچہ ہر پڑھے اور بے پڑھے مسلمان کا یہ پکا عقیدہ ہے کہ آنحضرت کا جسد اطہر مدینے کے حجرے میں دفن ہے لیکن مجھے شبہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ جگہ بھی ویسی ہی مشتبہ ہے، جیسی کہ بیت المقدس میں حضرت عیسٰی کی قبر ۔"

جواب اعتراض نمبر (۱)

حضرت عیسٰی کی قبر کی بنسبت البتہ شبہ ہو سکتا ہے وجہ اس کی یہ ہو کہ عیسوی معتبر روایات سے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
کوشش مصر کے فاطمی خلیفہ نے کی تھی، اس کوشش کی ناکامی کے متعلق وہ معجزات نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قبور کے گرد ایک خندق کھود کر اس میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا گیا ہے، تاکہ آیندہ ان اجسام کو کوئی چرا نہ سکے (مصر کے فاطمی خلیفہ کی کوشش کے بعد خندق میں سیسہ نہیں بھروایا گیا بلکہ پادری صاحب کے دو عیسائی بھائیوں کی ناکامی کے بعد اس قسم کی حرکتوں کا سدباب کیا گیا ہے، توضیحا برٹن کے اعتراض نمبر (۸) کا جواب دیکھا جائے)

(۱۱) بقول مسلمان مورخوں کے ۶۵۴ھ ہجری میں کوہ آتش فشاں کے تصادم سے مسجد نبوی برباد ہو گئی تھی مگر قبر کا حجرہ تمام نقصانات سے محفوظ رہا تھا، پھر ۸۸۶ھ ہجری میں اس پر بجلی گری، اس موقع پر بقول برکھارٹ سمہودی کہتا ہے کہ حجرہ کا اندرونی حصہ جب صاف کیا گیا تو ملبہ سے بھری ہوئی تین گہری قبریں پائی گئیں لیکن مورخ مذکور جب خود حجرے کے اندر داخل ہوا تھا تو اس نے قبروں کا کوئی نشان نہیں دیکھا، یہی مصنف کہتا ہے کہ جس تابوت میں آنحضرت دفن ہیں اس پر چاندی کا غلاف چڑھا ہوا ہے (پادری صاحب کی تاریخ دانی قابل داد ہے، ۶۵۴ھ ہجری کی آتش زدگی کوہ آتش فشاں کے تصادم سے نہیں ہوئی تھی بلکہ قندیل روشن کرتے وقت ہاتھ سے بتی چھوٹ کر کمل وغیرہ پر گر کے آگ لگ گئی تھی، دوسری آتش زدگی ۸۸۶ھ میں نہیں ہوئی بلکہ ۸۸۶ھ ہجری میں ہوئی تھی، مفصل جواب کے لئے برٹن کے اعتراض نمبر (۲) کا جواب ملاحظہ ہو)

(۱۲) آنحضرت کی وفات اور دفن کی ٹھیک جگہ کے متعلق سنی شیعوں کے اقوال مختلف ہیں،

(واقعات وفات و مقام دفن کے متعلق سنی شیعوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، صرف تاریخ وفات کی روایتیں مختلف وارد ہوئی ہیں، شیعہ ۲۸، صفر تاریخ وفات کہتے ہیں، سنیوں کے بعض مورخ ۲ ربیع الاول بتاتے ہیں) اور عام طور پر ۱۲ ربیع الاول مانی جاتی ہے، لیکن کسی شخص کی تاریخ وفات میں اختلاف ہونے سے یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کی قبر کو بھی فرضی سمجھ لیں، انجیل میں حضرت عیسٰی کے واقعات صلیب کے متعلق حواریوں کے اقوال میں بیسیوں اختلاف ہیں تو کیا ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صلیب کا واقعہ بھی فرضی ہے -

یہ ثابت ہے کہ صلیب دینے کے بعد حضرت مسیح کی لاش ان کے ایک شاگرد یوسف نامی نے پلاطس[1] سے مانگی اور اسے ایک قبر میں جو بہ اختلاف روایت کسی چٹان[2] یا کسی باغ میں کھودی گئی تھی رکھ کر قبر کے منہ پر ایک بڑا پتھر ڈھلکا دیا، مریم مگدلینی اور یوسیس کی ماں مریم قبر کے سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھیں[3]۔ یہودیوں نے اس خیال سے کہ حضرت عیسیٰ کے شاگرد لاش کو چرا نہ لیجائیں[4] اس قبر پر بھاری پہرہ مقرر کر دیا تھا[5]، مگر اس روز پہرے والے سپاہی ایک عید منانے میں مصروف ہو گئے تھے اور وہ قبر غیر محفوظ حالت میں ہی چھوڑ دی گئی تھی، سویرے کے روز مریم مگدلینی اور دوسری مریم جب قبر پر گئیں تو انھوں نے پتھر کو ڈھلکا ہوا پایا اور قبر کے اندر لاش کا پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد ایک فرشتے کی شہادت پر ان دونوں عورتوں نے جناب مسیح کے شاگردوں کو مطلع کر دیا کہ آپ زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے، نیز حضرت مسیح نے بھی اپنے شاگردوں پر ظاہر ہو کر اس کی تصدیق فرمائی[6]۔

بیان مذکورۂ بالا سے جو متی و لوقا و یوحنا کی انجیل سے اخذ کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ایک ہی آدمی نے دفن کیا تھا اور مقام قبر میں بھی اختلاف ہے کہ وہ کسی باغ میں تھی یا کسی چٹان میں، قبر پر پہرہ بھی متعین تھا جس کی وجہ سے معتقدان مسیح اس کے پاس جا بھی نہ سکتے تھے اور قبر کو خالی دیکھنے والی بھی بہ اختلاف روایات دو تین ہی عورتیں تھیں اور

---

[1] پلاطس وہ مجسٹریٹ تھا جس نے یہودی علما سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کو صلیب پر کھینچے جانے کا حکم دیا تھا،

[2] لوقا و متی چٹان میں قبر بتاتے ہیں۔ یوحنا باغ بیان کرتا ہے،

[3] انجیل متی ۲۷ آیات ۵۰ لغایت ۶۱

[4] یہودیوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ان کے شاگرد قبر میں سے نکال لے گئے اور یہ مشہور کر دیا کہ وہ آسمان پر چلے گئے، ہمارے زمانے کے بعض مسلمان علما نے بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب کے بعد قبر سے نکال لئے گئے اور تندرست ہو کر عرصہ تک زندہ رہے،

[5] انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۴

[6] انجیل متی باب ۲۸

حضرت مسیح صرف تین ہی دن قبر میں رہے اور یہ قبر دشمنوں کے علاقے میں واقع تھی، جو اس کے منہدم کر دینے اور مٹا دینے میں بھی تامل نہیں کر سکتے تھے، پس ایسی قبر کا اگر پتہ و نشان کسی کو یاد نہ رہے اور اگر کسی فرضی گڑھے کو قبر مسیح مشہور کر دیا جائے تو کچھ حیرت کی بات نہیں ہے، علاوہ ازیں چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک قبر مسیح یعنی "ہولی سپلکر" کا وجود تاریخوں میں نہیں پایا جاتا، سب سے پہلے ۳۲۶ء میں قسطنطین[1] اول شاہ روم نے اپنی ماں ملکہ ہلینا[2] کے ساتھ بیت المقدس کی زیارت کی، اور وہاں بشپ مکاریس کی مدد سے قبر شریف جناب مسیح (ہولی سپلکر) اور صلیب عیسیٰ کا پتہ لگایا، حضرت عیسیٰ کے ساتھ جن دو قیدیوں کو صلیب دی گئی تھی ان کی صلیبیں بھی اسی وقت برآمد ہوئیں، مگر اصلی صلیب کی شناخت اس طرح کی گئی کہ ایک بیمار عورت نے اس کو چھوا اور وہ تندرست ہو گئی، اس معجزے سے ثابت ہوا کہ یہ اصلی صلیب[3] ہے، اس کے بعد

---

[1] قسطنطین اول اپنے باپ کونسٹین ٹیئس کلارس کے مرنے کے بعد ۳۰۶ء میں روم کا بادشاہ ہوا، اس کو ایک جنگ کے وقت آسمان پر ایک آتشین صلیب نظر آئی تھی، اور یہ الفاظ دکھائی دیئے تھے کہ "اس صلیب کی خاطر فتح کر"، چنانچہ وہ عیسائی ہو گیا، اور سلطنت روم کا مذہب عیسائی قرار دیا، ۳۳۰ء میں اس نے شہر قسطنطنیہ آباد کر کے اسے اپنی سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا، یہ ۲۷۹ء میں پیدا ہوا تھا اور ۳۳۷ء میں مرا، اس کو قسطنطین اعظم بھی کہتے ہیں،

[2] یہ ایک نان بائی کی لڑکی تھی جس کو روم کے سپہ سالار کونسٹین ٹیئس کلارس نے بیوی بنا لیا تھا، یہ شخص شاہی خاندان کا ایک ممبر تھا، تخت روم خالی ہونے پر بادشاہت کے لئے اس کا انتخاب کیا گیا، وہاں کے رسم و رواج کے لحاظ سے بادشاہ ایک ادنیٰ طبقے کی عورت سے تعلق نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے اس نے ہیلینا کو طلاق دیدیا، اور وہ اپنے لڑکے قسطنطین (اعظم) کے ساتھ نہایت رنج و غم کی زندگی بسر کرنے لگی، جب قسطنطین روم کا فرمانروا ہوا اور اس نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تو یہ بھی عیسائی ہو گئی اور اپنے تئیں خدمت مذہب عیسوی کے لئے وقف کر دیا، اور خاوند کے طلاق دینے کی وجہ سے جو گوشہ تنہائی میں پڑی ہوئی تھی اس سے باہر نکلی اور کوئی اسی برس کی عمر میں بیت المقدس کی زیارت کے لئے اپنے فرزند قسطنطین اعظم کے ساتھ روانہ ہوئی اور اصلی صلیب کا پتہ لگایا، ہیلینا بیت المقدس میں کچھ عرصہ تک رہی اور بیت اللحم اور جبل زیتون پر گرجے بنوائے، آخر روم کو واپس ہوئی اور ۳۲۸ء میں اسی برس کی عمر میں وفات پائی، یہ عورت عیسائیوں میں بڑی بزرگ اور ولی سمجھی جاتی ہے، اور اسی اعتبار سے اس کو سنٹ ہیلینا کہتے ہیں،

[3] اس صلیب کے بڑے بڑے واقعات ہیں، نہایت مختصر یہ کہ ہلینا نے اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ

قسطنطین اور اس کی ماں نے اس جگہ جہاں سے صلیب برآمد ہوئی تھی مزار شریف اور ایک گرجا تعمیر کرادیا، اور قبر جناب مسیح نمودار ہوگئی[1]!

آنحضرت صلعم کے مرقد مبارک کی یہ حالت نہیں ہے۔ متعدد اشخاص نے آپ کو دفن کیا، تمام اہل مدینہ نے نماز جنازہ پڑھی، نہ آپ کی قبر شریف مخالفوں کے علاقے میں تھی، نہ اس پر کوئی پہرہ مقرر کیا گیا تھا، نہ اس کے محل وقوع میں سلف سے آج تک کسی کو اختلاف ہوا، حضرت مسیح کی قبر سوا تین سو برس تک لاپتہ رہی، آنحضرت کی قبر ایک دن بھی بے پتہ نہیں رہی، پس آپ کی قبر مبارک کو حضرت مسیح کی قبر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، جو اس کو بھی فرضی سمجھ لیں۔

اعتراض نمبر (۲)

برٹن کہتا ہے کہ: "آنحضرت ص کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی مدینے میں ہل چل مچ گئی تھی، اور لوگوں نے آنحضرت کو غیر فانی سمجھ کر آپ کی وفات کا یقین نہیں کیا تھا یہاں تک کہ حضرت عمر نے لوگوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی اس خبر کو سچ سمجھے گا تو قتل کر دیا جائے گا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیت المقدس کے پادری کو دیدیا، اور دوسرا حصہ قسطنطینیہ بھیجدیا، بیت المقدس اس وقت ہرقل شاہ روم کی سلطنت میں تھا، ایرانی جو ہرقل کی سرحد پر اکثر چھاپے مارا کرتے تھے صلیب کے اس ٹکڑے کو بیت المقدس سے لے گئے، ہرقل نے ۶۲۸ء میں بڑے جنگ کے بعد واپس لے لیا، اور بغرض حصول برکت قسطنطنیہ اس کو لاکر اولاً کلیسا یا صوفیہ کے گرجے کے مذبح پر رکھا، پھر بیت المقدس پہنچا دیا، اس کے بعد مسلمانوں اور مجاہدین صلیب کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں اور جن کا سلسلہ ۱۰۹۶ء سے ۱۲۴۹ء تک چلتا رہا، ان میں صلیب کا یہ ٹکڑا کبھی اُدھر سے اِدھر آیا، اور اِدھر سے اُدھر گیا، صلیب کے دوسرے حصے میں سے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے عیسائی دنیا کے تمام بڑے بڑے گرجوں میں تقسیم کر دئے گئے، اور یہ تبرک اب بھی بہت سے مقامات پر موجود ہیں، چنانچہ حیدرآباد کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے گرجے میں بھی اس صلیب مقدس کا ایک ٹکڑا کوئی پانچ انگل لمبا اور تین انگل چوڑا شیشے کے ایکسنریم میں رکھا ہوا ہے، جو یوم صلیب مسیح کی تقریب میں نکالا جاتا ہے، یہ گنہگار بھی کئی مرتبہ اس کو آنکھوں سے لگا چکا ہے۔

[1] تاریخ گبن، تمبٔ آف نائج، انسائکلوپیڈیا برٹانکا، انسائکلوپیڈیا آف انڈیا، چیمبرز انسائکلوپیڈیا وغیرہ،

علاوہ ازیں آنحضرت کا جسدِ مبارک ٹھنڈا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خلافت کے متعلق مہاجرین وانصار میں جھگڑا ہو گیا جس کے بارے میں شیعوں کا بیان ہے کہ حضرت علی اور جناب فاطمہ کے مکان کو جو اس جگہ سے جہاں اب روضہ (منورہ) ہے چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی (اور اسی) رات کو حضرت ابوبکر خلیفہ بنائے گئے،

جواب:۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کی وفات سے مدینے میں کھلبلی ضرور مچ گئی تھی مگر مسلمان آنحضرت کی زبان مبارک سے "انا بشر مثلکم"[1] سن چکے تھے اور قرآن کی یہ آیت پڑھ چکے تھے کہ "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم" یعنی محمد بھی خدا کے رسول ہیں جیسے ان سے قبل نبی گزرے ہیں اگر وہ مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم لوگ اپنے قدیم طریقے پر لوٹ جاؤ گے؟ اس وجہ سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان خلاف تعلیم قرآن آپ کو غیر فانی سمجھے ہوئے تھے .... اب رہی انبیا و شہدا کی حیات بعد ممات، وہ ایک دوسری چیز ہے اور وہ حیات مانع فنائے جسمانی نہیں ہے، حضرت عمر کا آنحضرت کی وفات کی خبر کو سچ نہ سمجھنا یا اس کے یقین کرنے والے کو قتل کی دھمکی دینا ممکن ہے کہ فرطِ غم کے باعث ہو، یا کسی سیاسی مصلحت پر مبنی ہو جیسا کہ اکثر بادشاہوں اور ناموروں کی موت کا اخفا کیا جاتا ہے اور نظم و نسق و انتظام قائم ہونے تک اُس کا افشا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں، اسی طرح کیا عجب ہے کہ حضرت عمر نے بھی اس خیال سے کہ ملحد، مرتد، یا منافق کوئی فساد برپا نہ کر دیں، آنحضرت کی وفات کی خبر مشہور کر دینا مناسب نہ سمجھا ہو مگر کچھ دیر بعد انھوں نے بھی وفات کا اعلان کر دیا اور پھر وفات یا قبر شریف کے متعلق اُن کو کوئی شبہ نہ رہا یہاں تک کہ حضرت ابوبکر کو وہاں دفن کیا اور خود بھی آنحضرت کی پائنتی دفن ہوئے،

---

[1] میں بھی تمہارے مثل آدمی ہوں،

اب رہا مسئلہ خلافت اور حضرت فاطمہ کے مکان کو جلانے کی دھمکی دینا[1] یہ بالکل بے تعلق بات ہے اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت کا جسد اطہر حجرۂ نبوی میں سپرد خاک نہیں کیا گیا۔

اعتراض نمبر (۳)

برٹن کہتا ہے:۔ "اگر کوئی شخص حیرت کرے کہ یہ ممکن نہیں کہ آنحضرت جیسے مشہور شخص کی قبر لاپتہ ہو تو اس کو مدینے ہی میں ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً حضرت فاطمہ کی قبر مدینے میں تین جگہ بتائی جاتی ہے[2]، حالانکہ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ آنحضرت کی صاحبزادی اور آئمہ (اطہار) کی والدہ (ماجدہ) کسی غیر مشہور قبر میں دفن نہ کی گئی ہونگی"۔

جواب۔ حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا کی تجہیز و تکفین و تدفین ان کی وصیت کے مطابق عمل میں آئی تھی اُن کے انتقال کی اطلاع کسی کو نہیں کی گئی تھی[3]، ان کی نماز جنازہ میں حضرت علی اور اہل بیت میں سے چند آدمیوں کے سوا اور کوئی شریک نہ تھا، اور رات کے وقت آپ دفن کی گئی تھیں، غالباً اس عدم تشہیر کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی کے ہاتھ سے چونکہ بہت سے دشمنان دین مارے گئے تھے، اس لئے جنابہ فاطمہ کے مدفن کو ظاہر نہ کیا گیا کہ مبادا مقتول کفار کے ورثاء قبر شریف کی بے حرمتی کریں[4]، جنابہ سیدہ کی قبر اطہر کی مثال حضرت سرور کائنات کے مرقد منورہ سے نہیں دیجا سکتی۔

---

[1] یہ واقعات سنی شیعوں میں مختلف فیہ ہیں ان کے متعلق میں کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا جو صاحب تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ کوئی تاریخ ملاحظہ فرمالیں۔

[2] جنابہ سیدہ پر چار جگہ سلام پڑھا جاتا ہے ایک تو روضہ صلعم کے متصل، دوسرے مسجد نبوی کے منبر اور قبر آنحضرت کے درمیان، تیسرے جنت البقیع میں، چوتھے جنت البقیع کے متصل بیت الحزن میں۔

[3] جنابہ سیدہ نے بروایت مشہورہ آنحضرت کی وفات کے چھ مہینے بعد سنہ ۱۱ھ میں وفات پائی، انتقال سے کچھ دیر قبل آپ نے رات کے وقت جنازہ اٹھانے اور پردہ کا لحاظ رکھنے کے متعلق وصیت فرمائی، اس وقت حضرت ابوبکر کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس موجود تھیں انھوں نے اس تابوت کا ذکر کیا جو انھوں نے حبش میں عورتوں کے جنازے کے لئے استعمال کرتے دیکھا تھا اور اس کا نمونہ بھی بنا کر جنابہ سیدہ کو دکھایا آپنے اس کو پسند فرمایا اور اس کو دیکھ کر مسکرائیں۔ آنحضرت کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا جو آپ نے تبسم فرمایا، اس کے بعد آپ نے رحلت فرمائی اور اسی قسم کے تابوت میں جو سب طرف سے ڈھکا ہوا تھا آپ کو اٹھایا گیا۔

[4] اسی بنا پر حضرت علی کا مزار مبارک بھی اول اول غیر مشہور رہا تھا۔

جس کے محل وقوع اور جگہ کے تعین میں آنحضرت کی تاریخ وفات سے آج تک کسی کو اختلاف نہیں ہے، آپ کی تجہیز وتکفین کوئی مخفی طور پر عمل میں نہیں آئی تھی جس کے سبب اہل مدینہ کو آپ کے دفن کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہوتا، علاوہ ازیں یہ ضرور نہیں کہ اگر کسی مشہور ومعروف شخص کی قبر کے تعین میں اختلاف ہو تو دوسرے مشاہیر کی قبروں کی نسبت بھی ہم شبہ کرنے لگیں،

اعتراض نمبر (۴)

برٹن کہتا ہے کہ "ابتدا سے آج تک آنحضرت کی قبر کی وضع عالم اسلام میں کسی کو معلوم نہیں ہوئی، یہی سبب ہے کہ بعض ممالک میں قبریں ابھری ہوئی بنائی جاتی ہیں اور بعض جگہ چپٹی، اگر قبر (شریف) کی شکل معلوم ہوتی تو لوگ اسی کو سنت قرار دے کر اسی شکل کی قبریں بناتے اور پھر قبروں کی وضع میں اختلاف نہ ہوتا۔"

جواب - حجرۂ مبارک جس میں آنحضرت دفن ہیں ابتدا میں وہ ام المومنین حضرت عائشہ کے مکان میں کھجوروں کی شاخوں سے بنا ہوا تھا، آنحضرت نے اسی حجرے میں وفات فرمائی اور وہیں دفن کئے گئے، اور حضرت عائشہ بھی بدستور اسی میں مقیم رہیں، قبر شریف اور ان کے گھر کے درمیان کوئی آڑ نہ تھی، جب مسلمان زیارت قبر شریف کے لئے بے دھڑک گھسنے لگے تو حضرت عائشہ نے اپنے مکان اور قبر شریف کے بیچ میں ایک دیوار اٹھائی، اس کے بعد ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر اسی میں دفن کئے گئے، حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں جب مسجد نبوی کی تعمیر کرائی تو ۱۷ ہجری میں حجرہ شریف کو کچی اینٹوں سے بنوا دیا، اور اس میں ایک دو دروازے بھی رکھے، دیوار میں ایک سوراخ بھی تھا اس میں سے ہاتھ ڈال کر لوگ تبرکاً مرقد مبارک کی خاک بھی اٹھا لیا کرتے تھے، بعد ازاں ۲۵ھ میں حضرت عمر اسی حجرے میں دفن کئے گئے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے بھی ۵۰ ہجری میں یہ وصیت فرمائی تھی کہ ان کو اس حجرے میں یعنی ان کے نانا کے پہلو میں یا جنت البقیع[1] میں دفن کریں، جناب امام حسن علیہ السلام کی یہ وصیت

---

[1] جنت البقیع مدینہ منورہ کا مشہور قبرستان ہے جس میں بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ہیں، ان میں ایک بڑا گنبد ہے جو قبۂ عباس یا قبۂ اہل بیت کے نام سے موسوم ہے، اس میں جناب امام حسن علیہ السلام و امام زین العابدین و امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہم السلام دفن ہیں، نیز جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی قبر بھی بروایت مشہورہ اسی قبہ میں بتائی جاتی ہے

خاندان رسالت کے ایک بڑے رکن ہونے کی وجہ سے اس امر کے ثبوت کے لئے کہ آنحضرت اسی حجرے میں مدفون ہیں بہت اہم شہادت ہے۔ (خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ مولفہ سید سمہودی مطبوعہ مکہ معظمہ) سید سمہودی بروایت معتبر نقل کرتے ہیں کہ جب قاسم[1] بن محمد بن ابوبکر نے اپنی پھوپی حضرت عائشہ سے ان قبروں کی زیارت کے لئے عرض کیا تو انھوں نے حجرہ کھول دیا، قاسم نے تین قبریں دیکھیں جو نہ تو زاید بلند تھیں، اور نہ زمین سے ملی ہوئی یعنی کسی قدر اٹھی ہوئی چپٹی قبریں تھیں، اور ان پر موضع عرصہ کے سرخ رنگ کے سنگریزے بچھے ہوئے تھے، علاوہ ازیں حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری میں سفیان ثوری اور ابوداؤد کی دو روایتیں موجود ہیں جن سے آنحضرت کی قبر کا مسطح یعنے چپٹا ہونا ثابت ہے، (نزہتہ الناظرین مولفہ جعفر برزنجی مطبوعہ مطبع جمالیہ مصر صفحہ ۶۵) قبروں کی ترتیب یہ تھی کہ اول آنحضرت کی قبر ان کے دوش مبارک کے محاذی حضرت ابوبکر کا سر اور آنحضرت کے پائے مبارک کے نزدیک حضرت عمر کا سر (خلاصۃ الوفا باب چہارم فصل ہم صفحہ ۱۴۱) حضرت عمر کا بنوایا ہوا کچی اینٹوں کا حجرہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک رہا، ۹۱ھ ہجری میں ولید[2] بن عبدالملک کے حکم سے عمر بن عبدالعزیز[3] حاکم مدینہ نے وہ حجرہ منہدم کرا کے منقش پتھروں سے حجرہ تعمیر کرایا اور اس کے باہر ایک اور حجرہ بنوایا، اور دونوں حجروں میں سے کسی میں بھی دروازہ نہ رکھا، اُس وقت سے قبر شریف حضرت سرور کائنات زائروں کی نگاہ سے پوشیدہ ہوگئی، (خلاصۃ الوفا و نزہتہ الناظرین و جذب القلوب)

بیان مذکورۂ بالا سے واضح ہے کہ ۹۱ھ تک یعنی آنحضرت کی وفات سے جو ۱۱ ہجری میں ہوئی

---

[1] قاسم حضرت ابوبکر کے پوتے اور جلیل القدر تابعی تھے، امام جعفر صادق علیہ السلام ان کے نواسے تھے، قاسم کی وفات ۱۰۱ ہجری میں ہوئی اور مدینہ منورہ میں دفن ہوئے،

[2] ولید بن عبدالملک خاندان بنی امیہ کا چھٹا خلیفہ تھا، ۸۶ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا، اس کے زمانہ میں مسجد نبوی کی توسیع و حجرۂ شریف کی تعمیر ہوئی جس کی ابتدا ۸۸ ہجری میں اور اختتام ۹۰ھ یا ۹۱ھ میں ہوا، ولید کی وفات ۹۶ ہجری میں ہوئی،

[3] عمر بن عبدالعزیز خاندان بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے، اور اس تمام خاندان میں نہایت نیک تھے ڈھائی سال خلیفہ رہے، ۱۰۱ ہجری میں وفات پائی،

اسی برس بعد تک حضرت عمر کا بنوایا ہوا حجرہ قائم رہا اور اس وقت تک آنحضرت کا مرقد مبارک
اور دونوں صحابہ کی قبریں زیارت گاہ خاص وعام رہیں، اور حجرے کا دروازہ کھول کر اور
اس کی دیوار کے سوراخ میں سے لوگ زیارت کرتے رہے، اور آنحضرت کی قبر شریف کی وضع
وشکل کی زیارت سے مشرف ہوتے رہے، اس پر برٹن کا یہ کہنا کہ "ابتدائے اسلام سے آنحضرت
کی قبر کی وضع کسی کو معلوم نہیں" سخت غلطی ہے،
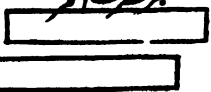
اب رہا یہ امر کہ آنحضرت کی قبر کی وضع سنت سمجھ کر تمام اسلامی ممالک میں اسی وضع کی قبریں
کیوں نہیں بنائی جاتیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اس کام کو کہتے ہیں، جو آنحضرت نے خود کیا،
یا جو کام آپ کے سامنے کیا گیا اور اس کو آپ نے منع نہ فرمایا، اس اصول سے آنحضرت کی قبر جو بعد
وفات بنائی گئی اس کی وضع سنت نہیں کہلا سکتی، اور نہ اس کی اتباع واجب ہے، اس وجہ سے
مختلف ممالک میں مختلف شکل کی قبریں بنائی جاتی ہیں، البتہ آنحضرت نے اپنے صحابہ وغیرہ
کی قبریں جس وضع کی بنوائی تھیں، وہ سنت کہلا سکتی ہے، مثالاً ہم مختصر طور پر دو ایک بزرگواروں
کے حالات دفن لکھتے ہیں، مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں سب سے پہلے حضرت عثمان
بن مظعون صحابی مہاجر دفن ہوئے، جن کا سنہ وفات باختلاف روایت ۲ھ یا ۳ھ ہجری ہے،
ان کی قبر کی نسبت آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ لحد بنائیں، دفن کر دینے کے بعد ایک پتھر بچ رہا تو،
آنحضرت نے اپنے دست مبارک سے اٹھا کر قبر کے سرہانے نصب کر دیا،
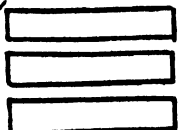
جب سیدنا ابراہیم ابن رسول اللہ نے جمادی الثانی ۹ھ ہجری میں چھ مہینے کی عمر میں وفات پائی
تو حسب الارشاد آنحضرت ان کو عثمان بن مظعون کے پہلو میں دفن کیا گیا، اور آنحضرت نے
اپنے ہاتھ سے قبر ابراہیم پر مٹی ڈالی. پانی چھڑکا اور سنگریزے بچھائے،
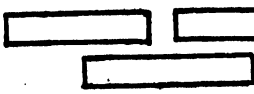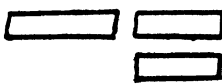
مذکورۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ قبر کا لحد بنانا، ہو سکے تو سرہانے کوئی پتھر نصب کرنا، قبر پر
مٹی ڈالنا، پانی چھڑکنا اور سنگریزے بچھانا سنت ہے، قبر کی بیرونی ساخت کے متعلق کوئی تخصیص
نہیں ہے، چاہے چپٹی بنادیں یا ڈھلوان رکھیں، چنانچہ اسلامی ممالک میں مسطح اور ڈھلوان دونوں

وضع کی قبریں بنائی جاتی ہیں، اور دوسرے امور یعنی لحد بنانا، پانی چھڑکنا وغیرہ بطور سنت انجام دیے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہو کہ مذہب اسلام نے انسداد قبر پرستی کے خیال سے قبر کی شکل و وضع کو بہت ہی ناقابل التفات شے قرار دیا ہے، اسی بنا پر پختہ قبروں سے جو خلاف سنت ہوتی ہیں، کچی قبریں افضل سمجھی جاتی ہیں، اور یہ ہو کہ، جو چیز فنا ہونے والی اور مٹ جانے والی ہو، اُس کے قیام کی فکر کرنا اور اس کی ظاہری وضع وقطع کو زیادہ اہمیت دینا ہی عبث ہے،

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

اعتراض نمبر ۵

برٹن کہتا ہو کہ "علی العموم سب لوگوں کا خیال ہو کہ حجرہ (مبارک) میں تینوں قبریں اس طرح بنی ہوئی ہیں:۔

قبر حضرت عمر
قبر حضرت ابوبکر
قبر آنحضرت

مگر مسلمان مورخ اس سیدھی سادی بات پر بھی متفق نہیں ہیں، کوئی کہتا ہو کہ حجرۂ شریف میں تینوں قبریں برابر برابر اس طرح بنی ہیں:۔ کوئی کہتا ہے کہ آنحضرت کی قبر مبارک آگے ہے، اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی قبریں اس کے پیچھے ہیں، یعنے اس طرح

بعض مورخ یہ ترتیب بتاتے ہیں":۔

جواب

یہ بات مسلمان مورخوں کی انتہا درجے کی صاف بیانی و حق گوئی کی دلیل ہو کہ وہ کسی واقعہ کی نسبت صرف اسی روایت پر اکتفا نہیں کرتے، جو تحقیق کے بعد ان کو صحیح معلوم ہو، بلکہ اُس واقعہ کی نسبت ان کو جس قدر روایتیں دستیاب ہوتی ہیں، بلالحاظ قوی و ضعیف سب لکھ دیتے ہیں،

لیکن اس کے ساتھ ہی اکثر مورخین اصول درایت کے اعتبار سے روایت کے ضعف وصحت کی بھی صراحت کر دیتے ہیں، چنانچہ ترتیب قبور حجرہ شریف کے متعلق جو مختلف روایتیں آئی ہیں ان سب میں بالاتفاق تمام مورخ شکل اول ہی کو صحیح سمجھتے ہیں، جس کے راوی نہایت معتبر ہیں اور سلسلہ روایت حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر تک پہنچتا ہے، جس کی صراحت جواب نمبر (۴) میں کی جا چکی ہے، اب رہی یہ بات کہ ان قبروں کی مختلف ترتیب لوگوں نے کیوں بیان کی اور سب نے ایک ہی ترتیب کے ساتھ ذکر کیوں نہ کیا، اس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ایک عرصہ کے بعد قلمبند کیا جاتا ہے اور روایت در روایت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے تو اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ترتیب وغیرہ میں اختلاف ہو جایا کرتے ہیں، امتداد زمانہ کے باعث روایتوں میں اختلاف پیدا ہو جانا تو بالکل بدیہی و لازمی بات ہے، لیکن اگر کسی واقعہ کے پیش آتے ہی بلا توقف وفی الفور دس آدمی چشم دید حالات بیان کریں تو دس آدمیوں کی دس باتیں ہوں گی، اور اس قسم کی سیدھی سادھی باتوں میں وہ بمشکل متفق ہو سکیں گے، اگر ایک ہی گھر کے رہنے والوں سے اُن کے مکان کے دروازوں، سیڑھیوں اور طاقوں کی ترتیب و تعداد کے بارے میں سوالات کئے جائیں تو ممکن نہیں کہ اُن کے بیان میں اختلاف نہ ہو، میرے خیال میں دنیا میں ایسے بہت کم لوگ نکلیں گے جن کو اپنی ہر دالان کی تفصیل اور اپنے باپ دادا کی قبروں کی ترتیب ٹھیک ٹھیک یاد ہو، پس حجرہ شریف کی قبروں کی ترتیب کے بیان میں بھی اگر اختلاف ہوا تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، علاوہ ازیں ان قبور کی ترتیب کے مختلف شکلیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ان میں کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے، پہلی اور دوسری شکل قریب قریب یکساں ہیں تیسری اور چوتھی شکل میں بھی کچھ یوں ہی سا فرق ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ پچھلی تینوں شکلیں اسی ایک پہلی شکل کے مختلف نقشے ہیں، جو ذرا ذرا سی سہو نظری کے باعث راویوں نے قائم کرلئے ہیں، یہ تو محض انہیں قبروں کا حال ہے کہ ان کی تفصیل و تشکیل کے ساتھ ان کی ترتیب کے متعلق بھی علماء نے تحقیق اور چھان بین کی ہے، ورنہ دنیا کے بہت سے پیغمبروں، پیشواؤں، او

بانیان مذہب کی قبروں کو کوئی جانتا بھی نہیں کہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں، یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مسلمان اس قسم کے متبرک مقامات میں پہنچکر کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتے ہیں، اس وقت تصور و مراقبہ اُن کو اینٹ پتھر کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کی اندرونی حالت مسلمانوں سے بہتر بعض عیسائیوں نے لکھدی ہے، مسلمان وہاں ہیبت کے مارے ادھر اُدھر دیکھ نہ سکے، خدا کے خوف سے لرزتے کانپتے روتے دھوتے رہے اور عیسائیوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سب کچھ دیکھ لیا کہ دیوار پر غلاف کس کپڑے کا ہے، چھت میں کتنے شہتیر ہیں، اور قندیلیں سونے کی ہیں یا چاندی کی،

اعتراض نمبر (۶)

برٹن کہتا ہے:۔ "اس بارے میں علما کے اقوال بھی مختلف ہیں، سمہودی[۱] جو سب سے زیادہ معتبر مورخ ہے اپنے قول کی خود تردید کرتا ہے، ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ آنحضرت صندوق میں دفن ہیں اور بقول برکھارٹ[۲] سمہودی کے یہ الفاظ ہیں:۔ "پارے سے ڈھکا ہوا سیاہ پتھر کا ایک مربع حجرہ ہے، جس کے اندر آنحضرت اور دو صحابہ کی قبریں ہیں جو بہت گہری ہیں، اُس صندوق پر جس میں آنحضرت دفن ہیں چاندی منڈھی ہوئی ہے اور اس کے ڈھکنے پر سنگ مرمر کا کتبہ

---

[۱] سمہودی کا پورا نام سید نورالدین علی بن عبداللہ ہے، یہ قصبۂ سمہود واقع مصر کے رہنے والے تھے اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں تھے۔ ان کی کتاب خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ جو ۸۹۳ ہجری میں تالیف ہوئی تواریخ مدینہ میں سب سے زیادہ مستند کتاب ہے، سمہودی کو سمنہودی اور سمہنودی بھی کہتے ہیں، ان کی وفات ۹۱۱ھ میں بہ مقام مدینہ منورہ ہوئی،

[۲] برکھارٹ باشندہ سوئٹزرلینڈ نے ۱۸۱۴ء میں سفر حجاز کیا تھا، یہ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہلاتا ہے، اس کی تصانیف میں سفرنامہ عرب، سفرنامہ شام، سفرنامہ نوبہ اور بدویوں اور عربوں کے حالات بہت مشہور ہیں، اس کے سفرنامہ عرب کا ترجمہ یہ درویش اردو میں مکمل کر چکا ہے، اس کے تفصیلی حالات بہ سلسلہ مضمون ہذا سابق میں شایع ہو چکے ہیں، برکھارٹ کا سفرنامہ عرب اس کی وفات کے بعد مرتب ہوا تھا اس لئے غالباً حجرہ شریف کے حالات میں مرتب کنندگان نے کچھ تحریف کر دی ہے ورنہ برکھارٹ جیسے محقق سے یہ امر بعید تھا کہ وہ سمہودی کا مطلب نہ سمجھتا یا غلط بیانی کرتا،

نصب ہی جس پر بسم اللہ اور اللہم صل علیہ کندہ ہے" دوسرے مقام پر سمہودی لکھتا ہی کہ "۸۹۲ھ میں جب قائد بے[1] نے حجرہ شریف کی مرمت کرائی تھی تو میں حجرے میں داخل ہوا اور اس کے اندر تین گہری قبریں دیکھیں جو ملبے سے ڈھکی ہوی تھیں، مزاروں کا وہاں کوئی نشان نہ تھا، جب ملبہ ہٹایا گیا تو بڑی مشکل سے آنحضرت کی قبر معلوم ہوئی"

قلقشندی[2] لکھتا ہی کہ "حجرۂ مبارک کے اندر آنحضرت اور خلیفہ اول و دوم کی قبریں ہیں اور آنحضرت کے مرقد پر سنگ مرمر کا ایک چوکا نصب ہی"

ابن جبیر[3] جنہوں نے ۵۸۰ھ ہجری میں زیارت کی تھی تحریر کرتے ہیں کہ "آنحضرت کا تابوت آبنوس کا ایک صندوق ہی جو صندل کی لکڑی سے ڈھکا ہوا ہے اور اس پر چاندی کے پتر جڑے ہیں، وہ ایک پردے کے پیچھے رکھا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف لوہے کی جالی بنی ہوی ہے"

(سفرنامہ برٹن جلد اول صفحہ ۳۲۳ و ۳۲۴)

جواب - اگرچہ برٹن نے سید سمہودی، قلقشندی اور ابن جبیر کے بیانات کا اقتباس و ترجمہ غلط لکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ علما کو قبر شریف کے متعلق اختلاف ہی مگر پھر بھی اُس کا مطلب حاصل نہیں ہوا،

---

[1] ملک اشرف ابو النصر قایتبائی کو فرنگی قایدبے کہتے ہیں، یہ بادشاہ سلاطین مملوکہ چرکسیہ مصر میں نہایت ہی منیر و نیک گزرا ہے، اس کو مسجد نبوی کی تعمیر و درستی کا دو مرتبہ شرف حاصل ہوا، ایک دفعہ ۸۸۱ھ ہجری میں دوسری آتشزدگی سے قبل، دوسری مرتبہ ۸۸۸ھ ہجری میں دوسری آتشزدگی کے بعد جس کی صراحت حاشیہ میں آگے کی گئی ہے، سلطان ممدوح ۸۷۲ھ ہجری سے ۹۰۱ھ ہجری تک حاکم مصر و حجاز رہا،

[2] قلقشندی کا پورا نام الشیخ ابی العباس احمد القلقشندی المصری ہے، ان کی کتاب "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشا" فن انشا میں بے مثل و بے نظیر کتاب ہی جس کا ایک فقرہ برٹن نے لیکر بعد تحریف پیش کر دیا ہی، قلقشندی کی وفات ۸۲۱ھ ہجری میں ہوی،

[3] محمد ابن جبیر اندلسی قدیم سیاحوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں، یہ ۵۴۰ھ ہجری میں بمقام بلنسیہ پیدا ہوے تھے، ۵۷۸ھ ہجری میں حج و زیارت کی، اور ۶۱۴ھ ہجری میں بمقام اسکندریہ وفات پائی، ان کا سفرنامہ نہایت معتبر و مستند کتاب ہی جو ۱۸۵۲ء میں بمقام لیڈن واقع جرمنی عربی میں طبع ہوا ہی، اس کا ترجمہ مولوی احمد علی صاحب شوق رامپوری نے اردو میں بھی کر دیا ہے،

اور قبر شریف کا فرضی ہونا ثابت نہیں ہوتا، تینوں مورخین تذکرہ کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم اسی مقام پر دفن ہیں اور قبر مبارک اسی حجرے میں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آیا زمین میں دفن ہیں یا صندوق میں؟ یہ بھی ہم ابھی ثابت کر دیتے ہیں کہ اس امر میں بھی علما کو اختلاف نہیں ہے، صرف برٹن کی عدم قابلیت نے اس کو صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رکھا ہے، قبل اس کے کہ آنحضرت کے صندوق میں دفن ہونے یا نہ ہونے کے متعلق کچھ لکھا جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حجرۂ شریف اور اس صندوق کی مختصر کیفیت تحریر کر دیں تاکہ اس بات کے سمجھنے میں آسانی ہو کہ صندوق زیر بحث کیا چیز ہے، وہ کہاں رکھا ہوا تھا اور کس لئے،

حجرۂ شریف جس میں آنحضرت کی قبر اور حضرت ابوبکر و عمرؓ کی قبریں ہیں، ایک مربع سنگین حجرہ ہے جو سنہ ۹۱ھ سے بند چلا آرہا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اور بجز دو مرتبہ کے جس کی تفصیل آگے درج کی گئی ہے اور کبھی اس کے اندر لوگوں کا گزر نہیں ہوا۔ اس حجرے کے اوپر سبز رنگ کا اطلسی غلاف پڑا رہتا ہے[1] جس پر سفید ریشمی حروف میں کلمہ طیبہ اور صلوٰۃ و سلام بُنا ہوتا ہے۔ اس حجرے کے باہر کوئی چار چار گز جگہ چھتے یا گیلری کے طور پر چھوڑ کر

---

[1] سمہودی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے ہارون الرشید کی ماں خیزران نے سنہ ۱۷۰ ہجری میں حجرۂ شریف پر غلاف ڈالا تھا، اس کے بعد خلفائے بغداد وقتاً فوقتاً غلاف بھیجتے رہے، سنہ ۵۵۰ ہجری میں ابن ابی الہیجا وزیر مصر نے باجازت خلیفہ بغداد دیبائے سفید کا غلاف بھیجا تھا جس پر سرخ ریشم سے سورۂ یٰسین کڑھی ہوئی تھی، خلیفہ مستضئ بامر اللہ نے (۵۶۶ ہجری جلوس ۵۷۵ھ وفات) دیبائے بنفشی کا غلاف روانہ کیا تھا، خلیفہ الناصر لدین اللہ نے (۵۷۵ ہجری تا ۶۲۲ ہجری) دیبائے سیاہ کا غلاف بھیجا پھر دنوں بعد یہ طریقہ رہا کہ ہر چھٹے سال مصر سے غلاف آتا تھا، اس کے بعد ہر سلطان مصر اپنے جلوس کے وقت غلاف روانہ کرنے لگا، اس کے بعد سلاطین روم نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی اور نئے بادشاہ کے جلوس کے وقت غلاف بھیجنے لگے، جب نیا غلاف آتا ہے تو پرانا اتر کر تبرکاً تقسیم کر دیا جاتا تھا، پیشتر پرانے غلاف علیحدہ بھی نہیں کئے جاتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۲۳۳ ہجری کی آتشزدگی میں تہہ بر تہہ گیارہ غلاف جلے تھے،

سبز رنگ کی تخمیناً تین گز اونچی ڈھلی ہوئی تانبے کی جالی[1] سب طرف لگی ہوئی ہے اور حجرہ شریف اور جالی پر سبز گنبد[2] استادہ ہے، حجرے کی دیواروں اور جالی کے درمیان جو گیلری ہے اس میں جھاڑ فانوس وغیرہ آویزاں ہیں اور مختلف قسم کے زیورات و ظروف طلائی و تحائف جو نذر کے طور پر زائرین نے چڑھائے ہیں رکھے ہوئے ہیں، اس جالی میں اگرچہ چار دروازے ہیں مگر صرف ایک دروازے سے خدام وغیرہ بغرض صفائی و روشنی ہر روز اس جالی کے اندر داخل ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ حجرہ شریف کی دیواروں کو باہر کی طرف سے چھو سکتے ہیں، حجرے کے اندر جانے کے لئے نہ کوئی دروازہ ہے اور نہ جھانکنے کے لئے کوئی کھڑکی یا روشندان،

---

[1] اس زمانے کے سیاح و مورخین ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی صندل کی اُس جالی کا وجود بھی حجرے کے گرد ظاہر کرتے ہیں جو ۵۵۷ھ ہجری میں جمال الدین اصفہانی وزیر سلطان نور الدین زنگی شہید اتابک موصل نے حجرہ مبارک کے گرداگرد تیار کرائی تھی اور حجرے کے نقشے اس طرح دکھاتے ہیں کہ حجرے کے باہر صندل کی جالی پھر چار گز چوڑی گیلری اس کے بعد تانبے کی جالی جس پر سبز رنگ کیا ہوا ہے، حالانکہ حجرۂ شریف کے گرد اب صرف ایک جالی تانبے کی سبز رنگ کی نصب ہے، بات یہ ہے کہ جمال الدین بڑا فیاض و سخی تھا اس وجہ سے اس کا لقب جواد ہو گیا تھا، اس نے مدینے میں بڑے بڑے کارہائے خیر کئے جس کی وجہ سے اُس کا نام وہاں اب تک زندہ ہے، اور اگرچہ اس کی بنوائی ہوئی صندل کی جالی ۶۵۴ھ ہجری کی آتش زدگی میں جل گئی مگر عوام مدینہ کی نظروں میں وہ اب تک روضے کا اندر رکھی ہوئی ہے۔ قصہ مختصر سب سے پہلی جالی یہ صندل کی تھی، اس کے بعد ۶۶۸ھ ہجری میں ملک الظاہر رکن الدین بیبرس والی مصر نے لکڑی کی ایک جالی بنوائی جس کی بلندی دو قد آدم تھی، پھر ۶۹۴ھ ہجری میں الملک العادل زین الدین سلطان مصر نے حجرہ شریف کے باہر ایک جالی لکڑی کی استادہ کرائی جس کی بلندی مسجد کے نصف ارتفاع تک پہنچی ہو جب ۸۸۶ھ ہجری کی حریق ثانی میں یہ جل گئی تو سلطان مصر قایتبائی نے ۸۸۸ھ ہجری میں تانبے کی جالی نصب کرا دی جو اس وقت بھی موجود ہے، البتہ وقتاً فوقتاً اس کی اصلاح و ترمیم وغیرہ ہوتی رہی ہے،

[2] ملک المنصور قلاؤن الصالحی نے ۶۷۸ھ ہجری میں حجرۂ شریف پر قبہ بنوایا تھا جو اب تک موجود ہے، اس کی مرمت و درستی و رنگ آمیزی دوسرے سلاطین بھی حسب ضرورت کراتے رہے ہیں، چنانچہ سلطان قایتبائی نے ۸۸۸ھ ہجری میں اسے از سر نو تعمیر کرایا تھا، کئی صدیوں سے اس کا رنگ سبز چلا آرہا ہے اور گنبد خضرا کہلاتا ہے،

عام زائرین کو اس جالی کے اندر جانے کی بھی اجازت نہیں ہے کبھی کبھی بعض مقدس و متمول اشخاص کو بطور خاص جالی کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی ہے، البتہ جالی کے بیچ میں ایک ایک بالشت گول کٹی کھڑکیاں ہیں، ان میں سے جھانک کر زائرین جالی کے اندر کی کیفیت اور اس گیلری کی حالت معلوم کر سکتے ہیں، صندوق زیر بحث اسی جالی کے اندر منجملہ اور تحائف کے رکھا ہوا تھا جس سے غرض یہ تھی کہ صندل محفوظ رہے، مجسر اس کی خوشبو سے معطر ہو، آنحضرت کے سرہانے کی تمیز ہو سکے اور زائرین اس کے مقابل کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھیں، اگلے زمانہ میں اس صندوق کو صندوق مواجہہ شریفہ یعنی آنحضرت کے سرہانے کی سمت ظاہر کرنے والا صندوق کہتے تھے اور آج کل اس کو صندوق صندل کہتے ہیں[1]، جعفر برزنجی مدنی مولف کتاب نزہتہ الناظرین اس کے ذکر میں سمہودی و ابن جبیر کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کا کچھ عجب نہیں کہ اس صندوق کی ابتدا حضرت عمر کے زمانہ میں ہوئی ہو، اس وقت مسجد نبوی کی خوشبو کے لئے صندل عود و عنبر وغیرہ اس میں رکھتے ہوں گے، اس کے بعد دوسرے سلاطین و خلفا نے بھی اس کی پیروی کی، جب صندوق وغیرہ متعدد ہو گئے تو عود و عنبر دوسری جگہ رکھنے لگے، اور صندل کے واسطے یہ صندوق مخصوص کر دیا گیا (برزنجی صفحہ ۲، و ۳)

زمانہ قدیم سے آج تک روضے کے اندر صندوق صندل رکھنے کا دستور چلا آرہا ہے، چنانچہ اس زمانے میں بھی جالی کے اندر ایک صندوق اسی غرض سے رکھا ہوا ہے، زمانہ حال کے سیاحوں (ڈاکٹر نور حسین صاحب صابر وغیرہ) نے اپنے سفرنامہ میں اس صندوق کا ذکر کیا ہے، اور

---

[1] اس صندوق میں سے ہر سال پرانا صندل نکال کر زائرین کو تبرکاً و تیمناً دے دیا جاتا ہے، اور نیا صندل عطر و تری بیں گوندھ کر صندوق میں رکھ دیتے ہیں، پرانا صندل نکالنے اور نیا رکھنے کی رسم بھی بڑی دھوم سے ادا کی جاتی ہے، نیا صندل شیخ الحرم کے مکان سے لایا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ خواجہ سرا، خدام مسجد و مشائخ حرم کی جماعتیں، اور بعض اہل مدینہ کی مستورات بھی نعتیہ اشعار پڑھتی ہوئی آتی ہیں، اس کے بعد سب کے لئے نفیس کھانوں کا دسترخوان چُنا جاتا ہے، پھر اوقات تکبیر و تہلیل و صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہوئے صندوق مذکور میں صندل رکھ دیتے ہیں۔ (برزنجی صفحہ ۳)

صاحب کتاب السکینہ باخبار المدینہ[1] نے حجرہ شریف کے جو تین نقشے اپنی کتاب میں دئے ہیں ان میں جالی کے اندر یہ صندوق رکھا ہوا دکھایا ہے، اس ستون کو جس کے نیچے یہ صندوق رکھا ہوا ہے "اُسطوانۃ الصندُوق" کہتے ہیں، سید سمہودی نے جس صندوق کا ذکر حجرہ شریف کے بیان میں کیا ہے وہ یہی صندوق ہے جس کو برٹن نے خوش فہمی سے تابوت سمجھ لیا، مزید توضیح کے لئے مورخ ممدوح کی تاریخ خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفٰے کی بہم اصل عربی عبارت یہاں نقل کرتے ہیں:-

"اما علاتہ جھۃ الراس الشریف فصندوق مصفح بالفضۃ بِأَصلِ الاسطوانۃ اللاصقۃ بحائز القبر الشریف عند نھایۃ الصفحۃ الغربیۃ منہ مما یلی القبلۃ فی صف اسطوانۃ السریر واسطوانۃ التوبۃ ولو اعلم ابتداء احداثہ واقدم من ذکرہ ابن جبیر فی رحلتہ وکانت قبل العراق الاول عام ثمانین وخمسمائۃ وقال انہ قبالۃ راس النبی صلی اللہ علیہ وسلم (قلت) وفیہ تجوز فقد ظھر لنا انہ فی محاذاۃ الجدار الداخل القبلی والحد الشریف الی جدار المذکور کما سیاتی والاصل فی ذلک ما روی جعفر بن محمد بن علی بن الحسین عن ابیہ عن جدہ رضی اللہ عنہم ان کان اذا جاء یسلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقف عند الاسطوانۃ التی تلی الروضۃ ای وھی المتقدمۃ ثم یقول ھھنا راس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والمراد منہ ما قدمناہ وکان فوق ھذا الصندوق قائم من خشب یحیط بما ظھر من اسطوانۃ الی راس اعلی رخام الحجرۃ مصفح بصفائح الفضۃ المموھۃ فلما احترق مع الصندوق فی الحریق الثانی اعید الصندوق وجعل موضع القائم رخام کتب فیہ البسملۃ

---

[1] اس کے مولف مولوی محمد صبغۃ اللہ صاحب مہاجر ساکن مدراس ہیں جنہوں نے ۱۲۸۰ھ ہجری میں زیارت مدینہ منورہ کی تھی

والصلوٰۃ والتسلیم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیر ذلک"۔

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ مؤلفہ سمہودی مطبوعہ مطبع میریۃ الکائنہ مکہ

باب چہارم فصل (۱۱) صفحہ (۱۴۳)

ترجمہ عبارت مذکورۂ بالا کا یہ ہے :-

"سر مبارک کی سمت کی علامت ایک صندوق تھا جس پر چاندی کے پتر چڑھے ہوئے تھے اور وہ اس کھم کے نیچے رکھا ہوا تھا جو غربی دیوار کے سرے پر قبر شریف کے متصل ہے اور یہ مقام ستون سریر اور ستون توبہ کے سلسلے میں ہے مجھے معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی تھی، سب سے پہلے ابن جبیر نے اس کا ذکر اپنے سفرنامے میں حریق اول[1] سے قبل سنہ ۵۸۰ ہجری میں کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلعم کے سرہانے کی علامت ہے،

میں کہتا ہوں کہ اور ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (صندوق) دیوار داخل قبلہ رو اور لحد شریف کے محاذی تھا

---

[1] پہلی آتش زدگی مسجد نبوی میں سنہ ۶۵۴ ہجری میں ہوئی تھی، اول جمعہ رمضان المبارک کو شام کے وقت ایک خادم قندیلیں روشن کر رہا تھا کہ اتفاقاً اس کے ہاتھ سے بتی چھوٹ کر کمل اور بوریئے وغیرہ کے ڈھیر پر گر گئی اور اس میں سے شعلے بھڑکنے شروع ہوئے، بڑھتے بڑھتے آگ مسجد کی چھت تک پہنچ گئی اور کتابیں صندوق سامان خزانہ اور حجرۂ شریف کا غلاف جو تہ بر تہ گیارہ غلاف تھے سب جل گئے، یہاں تک کہ حجرۂ مبارک کی چھت بھی گر گئی، اور وہ منہدم ہو گیا، تمام مسجد نبوی میں صرف ایک حجرہ جس میں کچھ کتابیں، قرآن اور صندوق تھا محفوظ رہا، آغاز سنہ ۶۵۵ ہجری میں خلیفہ مستعصم باللہ نے مسجد کی تعمیر شروع کی اور بالآخر سلاطین مصر ملک منصور نور الدین علی ملک ظاہر رکن الدین کی کوشش سے سنہ ۶۵۵ ہجری میں تعمیر مکمل ہوئی،

دوسری مرتبہ ۱۳ رمضان المبارک سنہ ۸۸۶ ہجری کو پچھلے پہر سے منارۂ اذان پر بجلی گرنے سے آگ لگ گئی تھی، اس بجلی میں آگ کے سے شعلے نکلتے تھے جن سے مسجد کی چھت میں آگ لگ گئی، تمام شہر نے بجھانے کی کوشش کی، مگر قابو نہ چلا اور تقریباً نصف مسجد اور بہت سا سامان جل گیا، صرف حجرۂ شریفہ بالکل محفوظ رہا، اس کے اندر آگ کا اثر نہ پہنچا البتہ حجرۂ شریف کے متصل جو ستون تھے وہ جل گئے اور صندوق مواجہہ شریفہ اور وہ کوٹھری جو حجرۂ شریف کے قریب تھی جل گئی، اس کی اطلاع سلطان مصر قایتبائی کو کی گئی وہ فوراً متوجہ ہوا اور بہت سے کاریگر و سامان مصر سے روانہ کیا، آخر رمضان سنہ ۸۸۸ ہجری میں مسجد کی تعمیر ختم ہوئی۔

(۵)

جو دیوار مذکور کی طرف ہے جیسا کہ اب ذکر آتا ہے اور اس کی اصلیت اس روایت سے ہے جو جعفر[1] ابن محمد[2] ابن علی[3] بن حسین رضی اللہ عنہم نے اپنے پدر بزرگوار و جد امجد سے روایت کی ہو وہ یہ کہ جب وہ آنحضرت پر سلام پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے تو اس کھمبے کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے جو روضہ کے قریب ذرا آگے کی طرف ہے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اسی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک ہے اور اس سے ان کی مراد وہی مقام ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔۔۔ اور اس صندوق کے اوپر لکڑی کی ایک تختی تھی جو منقش تھی اور اس پر چاندی کے چمکدار پتر جڑے تھے، اور اس پہ حجرے کے اندر والے سنگین ستون کا بالائی حصہ آ رہا تھا جب دوسری آتشزدگی میں یہ تختی مع صندوق کے جل گئی تو دوسرا صندوق رکھ دیا اور اس تختی کی جگہ سنگ مرمر لگا دیا جس پر بسم اللہ و صلوٰۃ و سلام وغیرہ لکھ دیا گیا تھا۔"

برٹن کی دروغ بیانی پر ناظرین غور فرمائیں، سمہودی کے مذکورہ بالا بیان سے یہ کہاں مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صندوق میں دفن ہیں ہم نے مانا کہ برٹن نے تاریخ سمہودی خود نہیں دیکھی تھی بلکہ برکھارٹ کے سفرنامے سے سمہودی کا حوالہ دیدیا ہے جیسا کہ اس نے اپنے سفرنامے کی جلد اول صفحہ ۳۲۳ و صفحہ ۳۴۰ میں تحریر کیا ہے مگر یہ امر ایک محقق مورخ کی شان سے بہت گرا ہوا ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کتاب کا غلط حوالہ دیدے اور وہ بھی ایسے اہم امر کے متعلق، اس سے برٹن کی تحقیقات اور برکھارٹ کی عربی دانی آئینہ ہو گئی، چونکہ عیسائی عموماً صندوق میں دفن کئے جاتے ہیں اس لئے یہاں قبر کے ذکر کے ساتھ صندوق کا لفظ بھی جو آ گیا تو برٹن صاحب کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو گیا کہ آنحضرت صندوق میں دفن ہیں

---

[1] جعفر صادق علیہ السلام سلسلۂ امامت اثنا عشری کے لحاظ سے چھٹے امام ہیں ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں زہر سے شہید کئے گئے۔

[2] آپ پانچویں امام ہیں۔ آپ کے لقب باقر و ہادی وغیرہ ہیں ۵۷ھ ہجری میں آپ تولد ہوئے معرکۂ کربلا میں آپ تین سال کے تھے، ۱۱۴ھ ہجری میں زہر سے شہید کئے گئے۔

[3] آپ کا نام علی بن حسین اور لقب زین العابدین، سجاد، بیمار کربلا وغیرہ ہیں، آپ چوتھے امام ہیں، سنہ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۴ھ میں زہر سے شہید ہوئے۔

اور ساتھ ہی تابوت کی مناسبت سے سنگ مرمر کے چوکھے کو کتبہ سمجھ لیا اور یہ تصور کر لیا کہ جس طرح عیسائیوں کے تابوت پر متوفی کا نام و سنہ و ولادت و وفات وغیرہ عبارت لکھی جاتی ہے، ایسے ہی آنحضرت کے تابوت پر بسم اللہ اور اللہم صلی علی کندہ ہے،

اسی صندوق کا ذکر ابن جبیر نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے جس کا حوالہ سمہودی کے بیان میں بھی موجود ہے اور اس جگہ بھی برٹن نے تابوت سمجھا ہے بخیال برٹن سمہودی کے متضاد بیانی کا کامل صراحت کر چکنے کے بعد ہم ابن جبیر کی عربی عبارت پیش کر کے برٹن کی عربی دانی پر روشنی ڈالیں گے، سردست برٹن کے اعتراض کے دوسرے جز کی توضیح کی جاتی ہے جس کو اس نے سمہودی کے اختلاف بیانی سے تعبیر کیا ہے۔

سنہ ۸۸۱ ہجری میں سلطان قائد بے (قایتبائی) مصری کے زمانے میں حجرہ شریف کی مرمت کے وقت سمہودی کو جو شرف باریابی حاصل ہوا ہے اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ کے (باب ۲) فصل (۱۲) میں کیا ہے جس کا ترجمہ اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"شعبان ۸۸۱ ہجری میں دوسری آتش زدگی سے قبل سلطان مصر قائیتبائی نے حجرہ شریف کی دیواروں کی ترمیم کرنے اور بجائے چھت کے گنبد تعمیر کرانے کے لئے شمس ابن زمن کو مدینہ منورہ روانہ کیا، اور بعد صلاح مشورہ علماء وقت حجرہ کی دیواروں کو جو بعض جگہ سے شق ہو گئی تھیں، منہدم کیا گیا، اور دیواروں کا ملبہ جو قبور شریف پر گر گیا تھا جب صاف کر دیا گیا، تو اللہ تعالیٰ سے توفیق حسن ادب و تعظیم کے لئے دعا کر کے حجرے کے پیچھے کی جانب سے میں اندر گیا اور بعد صلوٰۃ و سلام و تشفع و توسل میں نے حجرے پر نظر ڈالی، اور اس خیال سے کہ ان مشتاقوں کے لئے بھی جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں ایک تحفہ لیجانا چاہئے، میں نے اپنی آنکھوں کو اس متبرک مقام سے متمتع کیا، میں نے دیکھا کہ اس حجرے کی سطح ہموار زمین ہے اور قبور شریف کے اس میں کوئی آثار نہیں ہیں، حجرے کے بیچ میں ایک جگہ کسی قدر بلند تھی اور کوئی نشان

خیال کیا کہ یہی مقام قبر شریف ہے، اور بعض لوگوں نے تبرکاً اس جگہ کی خاک اٹھائی مگر ان کا یہ خیال غلط تھا، کیونکہ آنحضرت کی قبر مبارک بروایت معتبر دیوار حجرے کے قریب ہے نہ کہ بیچ میں، اس کے بعد حجرے کی قبلہ رُخ دیوار کے نزدیک حسب روایات و اقوال مشہورہ قبریں بنا دیں اور ایک حجرہ و گنبد تعمیر کر دیا، اس حجرے کی دیوار شامی کے وسط میں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی گئی، جس میں سے عود و عنبر وغیرہ حجرۂ شریف میں سلگاتے تھے، جب بعض لوگ منتیں مرادیں ماننے کے لئے درخواستیں لکھ لکھ کر اس کھڑکی میں سے حجرے کے اندر ڈالنے لگے تو اس کھڑکی کو بھی بند کر دیا، اس عمارت کی تکمیل ٨٨١ھ ہجری میں ۷ شوال کو پنجشنبہ کے دن دوسری آتشزدگی سے قبل ہوئی"

(تاریخ سمہودی مطبوعہ مطبع میسریہ مکہ صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۱)

سمہودی کے بیان مذکورۂ بالا میں اور اس بیان میں جو برٹن نے نقل کیا ہے اختلاف ہے، سمہودی کی اصل عبارت میں یہ فقرہ نہیں ہے کہ "تین گہری قبریں دیکھیں" بر خلاف اس کے سمہودی فرماتے ہیں کہ حجرے کی سطح ہموار زمین ہے، سنہ تعمیر بھی برٹن نے غلط تحریر کیا ہے، یہ واقعہ ٨٨١ھ ہجری کا ہے نہ کہ ٨٩٢ھ ہجری کا، برٹن نے اس تعمیر کو دوسری آتشزدگی کے بعد کی تعمیر ظاہر کیا ہے، اس وقت کی تعمیر ٨٨١ھ ہجری میں ختم ہوئی تھی، اس آگ سے حجرہ شریف بالکل صحیح و سالم رہا تھا اور اس وقت اس کے اندر کوئی داخل بھی نہیں ہوا تھا،

آثار قبور کی عدم موجودگی کے متعلق سمہودی کا بیان بالکل صحیح و قرین قیاس و واقع ہے، کچی قبریں جو بلند یا ابھری ہوئی نہ ہوں اور جن پر مزار، لوح، کتبہ وغیرہ کچھ نہ ہو اور جو سینکڑوں برس تک موسم و آب و ہوا کے مختلف تغیرات تری اور نمی وغیرہ سے متاثر ہو چکی ہوں، جب ان پر ملبہ اور دوں کا ڈھیر گر جائے اور اس کو صاف کیا جائے تو بجز اس کے کہ وہاں سطح زمین ہموار معلوم ہو اور کیا دکھائی دے سکتا ہے؟[1] لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہاں قبریں کبھی تھی ہی نہیں،

---

[1] [illegible]

اور آنحضرت وہاں دفن ہی نہیں ہوئے لیہ ملحوظ رہے کہ حجاز کی مٹی میں لوچ بہت کم ہوتا ہے،
اور شوریت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ وہاں کے مکانات وغیرہ
عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے، یہاں تک کہ سو سوا سو برس کا کوئی خام مکان بھی شاذ و نادر
ہی وہاں دکھائی دیتا ہے، ایسے مقام پر بہ سبب امتداد زمانہ اگر قبروں کا بالائی حصہ بالکل مٹ جائے
تو حیرت کی بات نہیں ہے، یہاں ہندوستان کے ہر قبرستان میں ہزاروں کچی قبریں بنتی
رہتی ہیں اور باوجودیکہ وہ اونچی بھی ہوتی ہیں، اور ان پر چبوترہ بھی اکثر بنا دیتے ہیں، مگر
تھوڑے ہی دنوں میں ان کا اوپری حصہ مٹ مٹا کر زمین کی برابر ہو جاتی ہیں، کیا اس
قسم کی قبروں کو فرضی قبر کہا جا سکتا ہے؟

اب قلقشندی کے بیان کے متعلق ہم کو غور کرنا ہے کہ آیا در اصل قلشقندی کا ہی بیان ہے،
یا کپتان برٹن نے اس میں بھی کچھ کتر بیونت کر دی ہے، قلشقندی کا نام الشیخ ابی العباس
احمد القلقشندی ہے، ان کا سنہ وفات ۸۲۱ھ ہجری ہے، ان کی تصانیف میں صرف دو کتابیں
مشہور ہیں ایک "نہایت الادب فی معرفتہ القبائل العرب" جس میں عرب کے مختلف قبیلوں کا
شجرۂ نسب و سلسلہ خاندان درج ہیں، دوسری تصنیف "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشا" ہے،
جو ۸۱۴ھ ہجری میں تالیف ہوئی، یہ فن انشا پر ایک بے مثل تالیف ہے، اور چودہ ضخیم جلدوں
میں ختم ہوئی ہے، اس میں فن انشا کی ضرورت کے لحاظ سے تمام دنیا کی اسلامی سلطنتوں کی
مختصر تاریخ و جغرافیہ بھی ہے، برٹن نے اسی کتاب سے استدلال کیا ہے، اور قلقشندی نے مدینہ
کے حالات میں بہ ضمن ذکر مسجد نبوی حجرۂ شریف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک فقرہ
لیکر بعد تحریف پیش کر دیا ہے، برٹن کا تحریف کردہ بیان قلشقندی یہ ہے:-

"حجرے کے اندر آنحضرت اور خلیفہ اول و دوم کی قبریں ہیں اور آنحضرت
کے مرقد پر سنگ مرمر کا ایک چوکا نصب ہے"

اب قلشقندی کا اصل بیان ملاحظہ ہو:-

"وبه الحجرة الشريفة التي بها قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم وابوبكر وعمر رضي الله عنهما. بحجرته الشريفة دائر عليه مقصورة مرتفعة الى نحو السقف عليه ستر من حرير اسود، وخارج المقصورة بين القبر والمنبر الروضة التي اخبر به صلى الله عليه وسلم انها روضة من رياض الجنة"

(صبح الاعشیٰ مطبوعہ مطبع امیریہ قاہرہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۸)

مطلب اس کا یہ ہے کہ "اور اس (مسجد) میں حجرہ شریف ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قبر ہے، حجرہ پر سیاہ حریر کا غلاف پڑا ہوا ہے ایک بلند مقصورہ[1] بطور چھت کے حجرے کو گھیرے ہوئے ہے، اور مقصورہ سے باہر قبر و منبر کے درمیان وہ روضہ ہے جس کی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے کہ وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے"

عبارت مذکورۂ بالا میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ "آنحضرت کے مرقد پر سنگ مرمر کا ایک چوکا نصب ہے" چونکہ قلقشندی کا بیان خود برٹن نے اخذ کیا ہے، اس لئے اس کے متعلق کوئی تاویل نہیں ہو سکتی، بجز اس کے کہ یا تو برٹن نے قلقشندی کا بیان سمجھا نہیں، یا سمجھ کر عمداً اس میں تحریف کر دی،

اب ایک ابن جبیر باقی رہے، ان کا اصل بیان بھی ہم پیش کرتے ہیں جس سے ثابت ہے کہ برٹن نے ابن جبیر جیسے مشہور شخص کا غلط حوالہ دیکر اپنی عزت کو خاک میں ملا دیا ابن جبیر نے یہ ہرگز نہیں لکھا کہ "آنحضرت کا تابوت آبنوس کا ایک صندوق ہے" چنانچہ سفرنامہ ابن جبیر کی اصل عربی عبارت، جو انھوں نے حجرۂ شریف کی دیواروں اور صندوق مواجہہ شریفہ کے متعلق لکھی ہے حسب ذیل ہے:-

---

[1] مقصورہ، حجرہ، یہاں مراد جالی سے ہے جو حجرۂ شریف پر ایستادہ ہے،

"سعة الصفحة القبلية منها اربعة وعشرون شبرا وسعة الصفحة الشرقية ثلاثون شبرا وما بين الركن الشرقي الى الركن الجوفي صفحة سعتها تسعة وثلاثون شبرا ومن الركن العراقي الى القبلي اربعة وعشرون شبرا وفي هذه الصفحة صندوق ابنوس مختم[1] بالصندل مصفح بالفضة مكوكب بها هو قبالة راس النبي صلى الله عليه وسلم وطوله خمسة اشبار وعرضه ثلاثة اشبار وارتفاعه اربعة اشبار وفي صفحة التي بين الركن الجوفي والركن الغربي موضع عليه ستر مسبل يقال انه كان مهبط جبريل"

(سفرنامہ ابن جبیر طبع لیڈن واقع جرمنی مطبع بریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۹۳ ذکر مسجد رسول)

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "حجرے کی قبلہ رو دیوار (۲۴) بالشت، شرقی دیوار (۳۰) بالشت گوشہ شرقی و شمالی کے درمیان دیوار کی لمبائی (۳۹) بالشت اور گوشہ عراقی سے قبلہ رو دیوار کے کونہ تک (۲۴) بالشت ہے اور اسی دیوار کے پاس آبنوس کا ایک صندوق رکھا ہوا ہے جس میں صندل بھرا ہوا ہے اور اس پر چاندی کے چمکدار پتر جڑے ہیں، یہ آنحضرت کے سر مبارک کے امتیاز کی علامت ہے اس کا طول (۵) بالشت عرض (۳) بالشت اور بلندی (۴) بالشت ہے اسی دیوار کے پاس رکن شمالی و رکن عراقی کے درمیان ایک مقام ہے جس پر غلاف پڑا رہتا ہے اس کو مہبط جبرئیل کہتے ہیں"

---

[1] مولوی احمد علی صاحب شوق رامپوری جنہوں نے سفرنامہ ابن جبیر کا اردو میں ترجمہ کیا ہے "مختم بالصندل" کے معنے یہ لیتے ہیں کہ "اس پر صندل کی پچکاری کی ہوئی تھی" لیکن یہ صندوق چونکہ صندل رکھنے کے لئے تھا اس لئے واقعات و حقیقت کے اعتبار سے اس کے یہ معنی لینا کہ "اس میں صندل بھرا ہوا تھا" زیادہ موزوں ہے۔

اب ہم برٹن کے حوالہ علما کے بیان کا مقابلہ کر چکے، تینوں مورخین متذکرہ کے بیان سے واضح ہے کہ نفس مضمون کے متعلق اُن میں کچھ اختلاف نہیں، اور یہ برٹن کی کوئی خاص مصلحت یا اس کا حسن فہم ہے جس کی وجہ سے مورخین کے اقوال پیش کرنے میں اُس نے حسب ذیل غلطیاں کیں :-

(۱) سمہودی کے بیان میں صندوق مواجہہ شریفیہ کو تابوت سمجھ لیا،

(۲) سمہودی کے بیان میں یہ فقرہ بڑھا دیا کہ تین گہری قبریں دیکھیں،

(۳) ۵۵۱ھ ہجری کے واقعہ کو ۸۹۲ھ ہجری کا بیان کیا،

(۴) دوسری آتشزدگی سے قبل کی تعمیر کو بعد کی تعمیر بیان کیا،

(۵) قلقشندی کے بیان میں یہ فقرہ بڑھا دیا کہ آنحضرت کے مرقد پر سنگ مرمر کا چوکا نصب ہے"

(۶) ابن جبیر کے بیان میں صندوق مواجہہ شریفیہ کو تابوت بنا دیا،

(۷) اور اپنی طرف سے لوہے کی جالی لگا دی، اُس وقت لکڑی کی جالیاں تھیں جن کا ذکر ابن جبیر نے آگے کیا ہے،

سمہودی کا بیان جو برٹن نے بحوالہ برکھارٹ تحریر کیا ہے اس کی نسبت یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ عذاب و ثواب برگردن برکھارٹ، مگر قلقشندی و ابن جبیر کے بیانات جو کسی کی روایت نہیں ہیں، بلکہ خود برٹن نے ان کی کتابوں سے اخذ کئے ہیں، اُن کی نسبت برٹن کے مفید مطلب کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، اس تحریف و غلط بیانی نے برٹن کی عربی دانی و تحقیق کی سب قلعی کھول دی، اگر ابن جبیر کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا تو کاش وہ اس بات پر ہی غور کر لیتا کہ پانچ بالشت کے چھوٹے سے صندوق میں، جس میں سات آٹھ برس کا بچہ بھی بمشکل سما سکتا ہے، ایک معمولی قد و قامت کا انسان کیونکر دفن کیا جا سکتا ہے، اور زمانہ سرور کائنات میں، یا اس کے بعد مسلمانوں کو صندوق میں دفن کرنے کا کہیں دستور بھی ملا ہے یا نہیں؟ عجیب لطف ہے غیر مذہب والے اسلام کی روایات و عقائد پر حملہ کرتے ہیں

اور گرہ کی اپنی عزت بھی کھو دیتے ہیں،

چراغے را کہ ایزد بر فروزد   ہر آنکو پف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کرتا ہے اس پر پھونک مارنے والے کی ڈاڑھی جل جاتی ہے۔

اعتراض نمبر ۷

برٹن کہتا ہے:۔ "نو سو برس کی مدت دراز میں ممکن ہے کہ آنحضرت کا جسم فانی برخلاف عقیدۂ اہل اسلام خاک میں مل گیا ہوگا۔"

جواب ۔ حیات انبیاء علیہم السلام کے مختلف فیہ مسئلہ پر اس جگہ ہم بحث کرنا فضول سمجھ کر تھوڑی دیر کے لئے برٹن کے بیان کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ آنحضرت کا جسم مطہر نو سو برس کی بلکہ تیرہ سو برس کی طویل مدت میں بوسیدہ ہو کر خاک ہو گیا ہوگا لیکن اس سے بھی برٹن کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت کی قبر حضرت مسیح کی قبر کے مثل فرضی ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ کی قبر اول تو نعش سے ہی خالی ہو گئی تھی، پھر سوا تین سو برس تک اس کا کہیں وجود ہی نہ تھا، ایسی قبر کو جس میں مدفون کی نعش کیا اس کی مٹی بھی نہ رہی ہوگی قبر نہیں کہہ سکتے، پھر اور اس کا نام رکھا جا سکتا ہے، یا خیر فرضی قبر ہی کہو، مگر آنحضرت کی قبر کی یہ حالت نہیں ہے، اس کے متعلق جواب اعتراض نمبر (۱) میں کافی بحث کی جا چکی ہے مگر اس جگہ ہم یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وجود قبر کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ اس کے اندر مدفون کی لاش بغیر ٹھیس لگے ہوئے جوں کی توں موجود ہو، جس جگہ کوئی دفن کیا گیا ہو اور وہاں سے لاش زمین یا آسمان پر کہیں منتقل نہیں ہوئی ہو، اس جگہ کسی قسم کی بیرونی علامت قبہ، گنبد، چبوترہ، چھتری، یا مٹی کے ڈھیر کا موجود ہونا ثبوت قبر کے لئے کافی ہے، چاہے دفن شدہ کی لاش قبر میں محفوظ ہو یا خاک ہو کر خاک میں مل گئی ہو،

۱؎ سید سمہودی کی وفات ۹۱۱ ہجری میں ہوئی ہے اس لئے برٹن نے نو سو برس کی مدت کا تعین کیا ہے۔

۲؎ حیات انبیاء و شہداء کے متعلق تاریخ سمہودی و جذب القلوب وغیرہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

پس اس لحاظ سے اس قبر کو جس میں آنحضرت دفن کیے گئے فرضی نہیں کہا جا سکتا، خواہ جسم مطہر بالکل محفوظ و مصئون ہو یا کسی اور حالت میں ہو، اس قدر کہہ دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ برٹن کا یہ خیال کہ آنحضرت کا جسم فانی خاک ہو گیا ہو گا محض قیاس ہے، جب تک کسی مدفون کی قبر کی مٹی وغیرہ ہٹا کر اور تہہ تک پہنچ کر دیکھ نہ لیا جائے مدفون کے جسم کے عدم و وجود کی نسبت قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی، علاوہ ازیں جبکہ اس زمانے میں ہزاروں برس کی لاشیں عجائب خانوں میں محفوظ[1] موجود ہیں، اور سینکڑوں برس کی پرانی قبروں میں سے بعض لاشیں اچھی حالت میں آئے دن برآمد ہوتی رہتی ہیں، تو پھر آنحضرت کے جسم مطہر کے بالکل محفوظ سمجھنے میں تامل کی کوئی وجہ نہیں"

اعتراض نمبر ۸

برٹن کہتا ہے کہ "اس سے بھی بڑھ کر قرین قیاس یہ ہے کہ متعصب شیعوں نے جو کئی[2] برس تک اس روضے کے متولی و محافظ رہ چکے ہیں، ان کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا ہو گا"

جواب بالفرض شیعوں کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر سے محبت نہ سہی مگر آنحضرت صلعم کی جناب میں شیعہ ادنیٰ ترین بے ادبی بھی کفر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر برٹن صرف یہ کہہ دیتا کہ حضرت ابوبکر و عمر کی لاشیں شیعوں نے کہیں منتقل کر دی ہونگی تو ایک گونہ قابل توجہ بات ہوتی، لیکن آنحضرت کے جسد مبارک کے منتقل کرنے کا اتہام شیعوں کے سر

---

[1] اہل یورپ نے حنوط لگی ہوئی پرانی لاشیں جا بجا سے فراہم کر کے عجائب خانوں میں رکھی ہیں، چنانچہ فراعنۂ مصر کی لاشیں بھی اہرام مصری سے نکال کر قاہرہ۔ لندن و قسطنطنیہ کے عجائب خانوں میں رکھی گئی ہیں۔

[2] سنہ ۲۹۷ھ میں مصر کی سلطنت عبیداللہ مہدی کے قبضے میں آئی اور ۵۶۷ھ ہجری تک گیارہ سلاطین اس کی اولاد میں ہوئے، یہ لوگ خلفائے بنی فاطمہ یا عبیدیہ کہلاتے ہیں، ان کا طریق شیعۂ اسماعیلیہ تھا۔ حرمین شریفین پر بھی ان کی حکومت تھی، اس زمانے میں روضہ رسول اللہ کے متولی و مجاور وغیرہ اکثر شیعہ تھے، اس کے بعد بھی سادات و شرفائے مدینہ اکثر شیعہ رہے ہیں، چنانچہ قلقشندی کی [illegible] سے ظاہر ہے کہ [illegible] ہجری میں بھی امرا و اشراف مدینہ بنی حسین یعنی حسینی شیعہ سادات تھے،

تھوپنا بہت ہی بے تکی بات ہے، تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ شیعوں یا نصرانیوں یا ملحدوں نے آنحضرت کا جسد اطہر اور حضرت ابوبکر و عمر کے اجسام روضہ منورہ سے کسی اور جگہ منتقل کر دئے اب وہ روضہ ایک خالی گنبد رہ گیا ہے، تو اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس امر عظیم کی جرأت کی اور ایسی خوفناک مہم انجام دی انھوں نے منتقلی اجسام کا ذکر کیوں نہ کیا؟ تاکہ ان کا اصلی مقصد پورا ہو جاتا، ان کے اہل قوم ان کی اس ہمت کی داد دیتے اور مسلمان یا تو اس مقام کی زیارت کے لئے جانے لگتے جہاں وہ اجسام منتقل کئے گئے تھے یا لاپتہ ہونے کی صورت میں زیارت سے ہی دست بردار ہو جاتے، مگر کسی موافق و مخالف مورخ کی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حجرۂ شریف سے جسموں کی منتقلی عمل میں آئی۔ تحریر سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو قصے کہانی کے طور پر یا مقامی روایات کے طریقے سے بھی یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی، نہ کبھی مصر، عرب، ایران، شام و عجم کے عیسائی، یہودی، بت پرست، ملحد، وہابی[1] یا شیعہ نے اپنے ہم مذہب و ہم مشرب لوگوں سے اس کا ذکر کیا، نہ کسی مقام پر کوئی مقبرہ ان بزرگوں کے نام سے منسوب و موسوم موجود ہے[2]

اگر فی الحقیقت قبیلۂ بنو حسین کے شیعوں نے جو صدیوں تک مدینہ منورہ کے متولی و محافظ رہ چکے تھے، یہ دلیرانہ و شجاعانہ کام کیا ہوتا تو بڑی خوشی کے ساتھ ان کو تمام اطراف و اکناف عالم کے شیعوں کو یہ خوش خبری سنا دینی چاہئے تھی تاکہ آنحضرت کے پہلوئے مبارک میں

---

[1] اگرچہ وہابی انسداد قبر پرستی کے خیال سے گنبد اور قبریں مٹا دیتے ہیں، مگر مدفون کی لاش کو ہاتھ نہیں لگاتے،

[2] جب کبھی جسم کی منتقلی کسی مقام پر عمل میں آتی ہے یا اس قسم کے وجوہ شبہ پائے جاتے ہیں تو وہاں مزار کی علامت بنا دی جاتی ہے، مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کی جائے دفن کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اور قاہرہ کی مسجد جامع حسین؀ اور دمشق کی مسجد راس سیدنا حسین؀ میں مزار بنے ہوئے ہیں، حضرت زینب صلوٰۃ اللہ علیہا کا مزار بھی قاہرہ و دمشق میں دونوں جگہ بیان کیا جاتا ہے، حضرت علیؓ کا روضہ علاوہ نجف کے بخارا میں بھی روضہ سخی جان کے نام سے مشہور ہے،

حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے دفن ہونے کی وجہ سے بالغرض کوئی خلش ان کے دلوں میں ہوتی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رفع ہوجاتی اور آنے والی نسلیں ایسی بہادری کے کام کرنے والوں کو دعائے خیر سے یاد کرتیں، برخلاف اس کے تمام شیعہ مورخ اس پر متفق ہیں اور تمام دنیا کے شیعوں کا آج کی تاریخ تک یہی خیال راسخ ہے کہ اسی حجرہ شریف میں علاوہ آنحضرت کے حضرت ابوبکر و عمر بھی دفن ہیں، زمانہ قدیم سے آج تک عموماً ایرانی شیعہ مدینہ منورہ جاکر قبیلۂ بنو جہین کے اشخاص کے ہاں قیام کرتے ہیں اور ان کو اپنا مزور[1] مقرر کرتے ہیں، مگر قبیلۂ مذکور کے کسی شخص نے ان صحابہ کے اجسام کی منتقلی کا ذکر کبھی کسی شیعہ سے نہیں کیا، اگر سینہ بہ سینہ کوئی روایت ان لوگوں میں اس قسم کی چلی آئی ہوتی تو اپنے ہم مشرب لوگوں سے بیان کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا، اور پھر کھلتے کھلتے سب کو معلوم ہو ہی جاتا کہ روضہ منور خالی عمارت رہ گئی ہے مگر اب تک شیعہ ہزاروں صعوبتیں برداشت کرکے سال کے سال زیارت کے لئے مدینہ طیبہ برابر جاتے ہیں اور آنحضرت کے مزار مبارک پر ان کی حاضری وجود قبر مبارک کی کھلی ہوئی دلیل ہے،

برٹن نے خود اپنے سفرنامے میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی قبور پر ایرانیوں کے سلام پڑھنے کی کیفیت بالتفصیل لکھی ہے، جس سے ثابت ہے کہ ایرانی ابھی روضے میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی قبروں کا وجود یقینی سمجھتے ہیں،

واقعات متذکرۂ صدر اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ آنحضرت کا جسد اطہر یا حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے اجسام کی منتقلی ہرگز عمل میں نہیں آئی، لیکن بعض تاریخوں میں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ کئی مرتبہ منتقلی اجسام کی کوشش کی گئی تھی جو کارگر نہ ہوئی، چنانچہ ان کوششوں کا مجمل ذکر ہم معتبر کتابوں سے اقتباس کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو بھی ان واقعات سے خود نتیجہ نکالنے کا موقع مل سکے،

بحوالہ کتاب "ریاض النضرۃ" مولفہ شیخ محب الدین طبری و تاریخ "خلاصۃ الوفا"

[1] زیارت کی دعائیں پڑھانے والا

"نزہتہ الناظرین" و "جذب القلوب" وغیرہ میں ہے کہ ہارون بن شیخ عمر بن شمس الدین صواب دربان حرم نبوی روایت کرتے ہیں کہ حلب کے شیعوں میں سے کچھ لوگ امیر مدینہ کے پاس آئے اور بہت سا مال اس کو دینے کے لئے اس غرض سے لائے کہ وہ حضرت ابو بکر و عمر کے جسموں کو حجرۂ شریف سے نکالنے کی اجازت دیدے، امیر مدینہ نے اس بات کو قبول کر لیا اور شمس الدین کو بلا کر حکم دیدیا کہ جس وقت یہ لوگ حرم شریف کا دروازہ کھلوائیں کھول دینا اور جو کچھ کریں اس میں تعرض نہ ہونا۔ شمس الدین دربان کہتا ہے کہ جب نماز عشا سے فارغ ہو کر لوگ چلے گئے، اور دروازہ حرم شریف کا بند کر دیا گیا تو چالیس آدمی پھاوڑے، کدالیں، اور شمعیں ہاتھوں میں لے کر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، یعنی دروازہ کھول دیا اور کونے میں بیٹھ کر زار زار رونے لگے، وہ لوگ منبر شریف تک بھی نہیں پہنچنے پائے تھے کہ سب کے سب اس ستون کے پاس جو حضرت عثمان[1] کی بنوائی ہوئی عمارت کے قریب ہے زمین میں سما گئے، مدینے کا امیر منتظر تھا، جب دیر ہو گئی تو دربان کو بلا بھیجا، اس نے جو کچھ دیکھا تھا کہہ دیا مگر امیر کو یقین نہ آیا۔ دربان نے کہا کہ امیر خود چل کر دیکھ لے کہ اب تک زمین کے پھٹنے کا اثر باقی ہے، (مسعودی صفحہ ۱۵۴ - برزنجی صفحہ ۸۲)

اگرچہ حکایت مذکور کو طبری ثقات کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور راویوں کا نام بھی بتا دیا ہے مگر نہ اس واقعہ کا سنہ لکھا، نہ اس بادشاہ کا نام جس کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس کے تحت اس زمانے میں سلطنت حجاز و حلب تھی اور نہ اس امیر مدینہ کا نام ظاہر کیا جس نے حجرۂ شریف میں نقب لگانے کی اجازت دیدی تھی، اور وہ کونسا قحط الرجال کا زمانہ تھا جب سوائے ایک شمس الدین کے حرم نبوی کے اور کوئی دربان نہ تھے، ایسی صورت میں واقعہ مذکور تاریخی حیثیت سے گر گیا اور محض ایک کہانی رہ گئی، علاوہ ازیں "ریاض النضرۃ" کوئی تاریخ نہیں ہے، مناقب کی کتاب ہے اور یہ واقعہ فضائل عشرۂ مبشرہ[2] کے ضمن میں لکھا ہے اس لئے تاریخی واقعہ نہیں کہا جا سکتا، مناقب

---

[1] حضرت عثمان خلیفہ سوم نے بھی مسجد نبوی کی توسیع کی تھی، تعمیر کا آغاز ربیع الاول ۲۹ھ میں ہوا تھا اور تکمیل محرم ۳۰ھ ہجری میں ہوئی تھی۔ [2] عشرۂ مبشرہ سے مراد وہ دس اصحاب ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت نے دی از روئے روایات اہل سنت جو اصحاب قطعی جنتی سمجھے جاتے ہیں ان کے نام کسی شخص نے قطعہ ذیل میں نظم کر دئے ہیں۔
قطعہ وہ یار بہشتی آدمی ہاں ÷ بو بکر و عمر علی و عثمان ÷ سعد است و سعید و بو عبیدہ ÷ طلحہ و زبیر و عبد رحمن

میں حلب والیس سب بھر دیتے ہیں، اور اس قسم کے واقعات درج کرنے سے کسی تاریخی واقعہ کا
اظہار مقصود نہیں ہوتا بلکہ مولف کی اصل غرض اظہار منقبت ہوتی ہو اکثر ایسا ہوتا ہو کہ معابد و
مزارات و مقامات مقدسہ کو مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے معجزے مشہور کر دئے
جاتے ہیں جن میں وہاں بے ادبی کرنے والوں کے سزا کا ذکر ہوتا ہو، اور غرض اس سے یہ ہوتی
ہو کہ ان مقامات پر جرائم کا سدباب ہو جائے یا اقدام جرم کے لئے کسی کی ہمت نہ بڑھے،
اور ان مقامات سے عقیدہ رکھنے والوں کے اعتقاد میں پختگی زاید ہو جاے، کیا عجب ہو کہ
واقعہ مذکور بھی اسی خیال سے وضع کیا گیا ہو یا کسی مفتری نے سنی شیعوں میں تفرقہ ڈالنے
کے لئے یہ قصہ گھڑا ہو، یا فی الواقعی یہ معجزہ ہوا ہو، اگرچہ پابند مذہب اشخاص ظہور معجزات سے
انکار نہیں کر سکتے۔ تاہم لامذہب لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے
امیر مدینہ نے حلب والوں سے روپیہ کا روپیہ لے لیا ہو، اور سرنگ کھود کر ان کو زمین میں
زندہ دفن کر دیا ہو، اس کے بعد یہ قصہ معجز نما طریقے سے مشہور ہو گیا، دنیا میں ایسے دھو کے
اور فریبوں کی مثالیں کچھ کم نہیں ہیں،

دوسرا واقعہ یہ ہو کہ مصر کے دیوانے بادشاہ حاکم بامر اللہ[1] کو یہ خبط سمایا کہ اگر آنحضرت کا
جسد مبارک اور حضرت ابوبکر و عمر کے اجسام مصر میں منتقل کر دئے جائیں، تو ساری دنیا کے

---

[1] اس کا نام منصور اور لقب حاکم بامر اللہ تھا، یہ خلفائے فاطمیین یا عبیدیہ مصر میں چھٹا خلیفہ تھا، ۳۸۶ہجری میں بادشاہ ہوا، چونکہ عبید اللہ مہدی بانی سلطنت کی اولاد میں تھا اس وجہ سے یہ تاریخوں میں حاکم عبیدی کے نام سے مشہور ہے عجب دیوانہ تھا طرح طرح کے متضاد حکم دیا کرتا تھا، لوگوں کو قتل کرانے میں اس کو مزا آتا تھا، حجر اسود کو توڑنے کے لئے بھی اس نے کچھ آدمی مکہ معظمہ بھیجے تھے، مگر ناکامی ہوئی، باینہمہ دیوانگی فیاض و علم دوست تھا طریقہ اسماعیلیہ کا پابند تھا، کئی مسجدیں، مدرسے، اور رصد گاہیں اس نے بنوائی تھیں، قاہرہ کے پاس ایک پہاڑ ہے جسے المقطم کہتے ہیں، اس کی چوٹی پر ستارہ شناسی کے لئے اس نے ایک مکان تعمیر کرایا تھا، ۲۷ شوال ۴۱۱ھ ہجری کو حسب معمول عبادت کے لئے یا ستاروں کا معائنہ کرنے کے لئے صرف دو ملازموں کے ساتھ یہ وہاں گیا، اور ملازموں کو واپس کر دیا تو پھر وہاں سے واپس نہ آیا، غالبا کسی نے اس کو قتل کر دیا، اس نے ایک نیا مذہب بھی ایجاد کیا تھا، اور اپنے تئیں خدا کا اوتار کہا کرتا تھا، اس کے پیرو فرقہ دروز یا دروس کے لوگ جو علاقہ کوہ لبنان واقع شام میں رہتے ہیں، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہو، قیامت کے قریب ظاہر ہوگا،

مسلمان اس طرف زیارت کے لئے آنے لگیں گے، اور مصر و اہل مصر کے لئے دینی و دنیوی فوائد کا باعث ہوگا، چنانچہ اس نے قاہرہ میں ایک بڑا مکان اسی غرض سے بنوایا تھا، اور ابو الفتوح کو[1] جو اس کی طرف سے والی مکہ و مدینہ تھا، اس مہم کو انجام دینے کے لئے حکم دیا، اہل مدینہ اس کیفیت سے پہلے سے آگاہ ہو چکے تھے، اور سرزمین حجاز چونکہ حاکم بامر اللہ کے تصرف میں تھی، اس لئے ابو الفتوح پر قاتلانہ حملہ کرنے میں تامل کیا، آخر ایک مجلس میں جہاں ابو الفتوح بھی موجود تھا، ایک قاری نے بڑے جوش کے ساتھ موثر لہجے میں یہ آیت پڑھی:-

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

یعنی اگر تم ایمان لائے ہو تو کیا اس قوم سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور اپنے پیغمبر کو نکالنے کا قصد کیا، حاضرین مجلس میں اس وقت بے انتہا جوش و اشتعال پیدا ہو گیا، اور قریب تھا کہ ابو الفتوح کو مار کر وہیں ڈھیر کر دیں، ابو الفتوح پر بھی سخت ہیبت طاری ہو گئی، اور اتفاق سے اس رات کو ایک زلزلہ اور سخت آندھی چلی جس کو اس نے قہر و غضب الٰہی کی علامت سمجھا آخر وہ حاکم بامر اللہ کی ناراضگی کا ہر طرح سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا اور اس ارادے سے باز آ گیا،

(سمہودی صفحہ ۱۵۴ قلقشندی جلد (۴) صفحہ ۲۹۹)

اگرچہ واقعہ مذکورہ بالا ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس میں ہم اس قدر اور اضافہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ حاکم بامر اللہ پر وہ مثل صادق آتی ہے کہ "بد اچھا بدنام برا" بلکہ وہ تو بد بھی تھا اور بدنام بھی تھا، اس لئے کیا عجب ہے کہ ابو الفتوح نے اس سے سرکشی و تمرد اختیار کرنے کا یہ سبب قرار دیا ہو اور اہل حجاز کو اپنی طرف ملانے کے لئے یہ مشہور کر دیا ہو کہ اس نے منتقلی اجسام کا حکم دیا تھا۔

---

[1] ابو الفتوح الحسن بن جعفر الحسینی کو حاکم بامر اللہ نے ۳۹۰ھ ہجری میں امیر مکہ و مدینہ مقرر کیا تھا، عدم تعمیل حکم منتقلی اجسام یا مذہب اسماعیلیہ اختیار نہ کرنے کی وجہ سے حاکم بامر اللہ نے اس سے ناراض ہو کر امارت سے موقوف کر دیا، اس نے تمرد اختیار کر کے راشد باللہ اپنا لقب رکھا اور مکہ میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا، آخر میں اس نے حاکم بامر اللہ سے معافی مانگ لی، ۴۳۰ھ ہجری میں مرا اور آخر دم تک امیر حجاز رہا۔

اس لئے میں نے اس سے بغاوت کی، صاحب تاریخ جامع اللطیف[1] اور قلقشندی نے ابوالفتح کے تمرد کا ذکر کیا ہے اور قلقشندی نے تو جلد (۴) صفحہ (۲۶۹) میں بصراحت یہ لکھا ہے کہ حاکم بامراللہ نے ۴۰۰ھ ہجری میں اپنے عمال کو تبدیل مذہب کے لئے حکم دیا تھا، اس سے ابوالفتح نے انکار کر دیا اور راشد باللہ لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ مکے میں پڑھوایا تھا، بہر حال منتقلی اجسام کے متعلق حاکم بامراللہ کے منشا کا پورا نہ ہونا جب واقعہ مذکورۂ بالا سے ثابت ہے تو اس بارے میں زیادہ روشنی کی ضرورت نہیں ہے،

تیسرا واقعہ خندق الرصاص کا ہے، وہ یہ کہ ۵۵۰ھ ہجری میں سلطان نور الدین شہید محمود بن زنگی[2] والی شام نے ایک رات میں تین مرتبہ آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ دو شخصوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ مجھ کو ان کے شر سے بچا، سلطان نے یہ خیال کر کے کہ غالباً کوئی امر موجب ایذائے رسول اللہ ہے اسی وقت چند ملازموں کے ساتھ بہت سا روپیہ لے کر تیز اونٹوں پر روانہ ہوا، اور مدینے پہنچ کر ان ملعونوں کی گرفتاری کے لئے یہ ترکیب کی کہ انعام کے حیلے سے تمام اہل شہر کو طلب کیا مگر وہ دو شخص جو خواب میں نظر پڑے تھے دکھائی نہ دئے تو سلطان نے دریافت کیا کہ اب شہر میں کوئی باقی نہ رہا، لوگوں نے کہا کہ دو مغربی حاجی جو بڑے عابد و زاہد ہیں اور اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے وہ نہیں آئے، سلطان نے ان کو بھی بلوایا جب وہ حاضر ہوئے تو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ ملعون ہیں جن کو آنحضرت نے خواب میں دکھایا تھا، سلطان نے ان سے پوچھا تم کہاں رہتے ہو کہا اس رباط میں جو حجرۂ شریف کے پاس ہے، سلطان ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر ان کے حجرے میں گھس گیا وہاں قرآن

---

[1] جامع اللطیف مکہ معظمہ کی تاریخ ہے جو ۹۵۰ھ ہجری کی تالیف ہے اور ۱۳۲۱ھ میں مصر میں طبع ہوئی ہے مولف اس کے جمال الدین محمد جاراللہ ہیں،

[2] یہ بادشاہ بڑا بہادر سخی عادل اور متقی تھا، نصاریٰ سے اس نے بہت جہاد کئے، اور صلیبی جنگوں میں حمیت اسلامی کا پورا ثبوت دیا، اس کا سنہ ولادت ۵۱۲ھ ہجری سن جلوس ۵۴۱ھ ہجری اور سن وفات ۵۶۹ھ ہجری ہے،

اور وعظ کی کچھ کتابیں طاق پر رکھی ہوئی تھیں، اور ایک چٹائی ان کے سونے کے لئے پڑی
ہوئی تھی، سلطان نے چٹائی کو اٹھایا تو معلوم ہوا کہ ان ملعونوں نے ایک بڑی سرنگ حجرۂ شریف
کی طرف کھود دی ہے، یہ رات کو سرنگ کھودا کرتے تھے، اور تھیلوں میں مٹی بھر کر ادھر ادھر پھینک دیا
کرتے تھے، آخر بدپیٹ سے انھوں نے اقبال کیا، کہ وہ اسپین کے عیسائی تھے، اور وہاں کے نصاریٰ
نے مغربی حاجیوں کے بھیس میں ان کو مدینہ منورہ بھیجا تھا تاکہ حجرۂ شریف کے اندر داخل ہو کر جسد اطہر
کے ساتھ بے ادبی سے پیش آئیں، ان دونوں کو قتل کرکے جلا دیا گیا، اور حجرہ شریف کے گرد ایک
نہایت گہری خندق کھود کر کہ پانی تک پہنچ گئی تھی، اس میں سیسہ پگھلا کر بھر دیا کہ آئندہ وہاں تک
کوئی نہ پہنچ سکے، (سمہودی صٓ ۱۵۳ برزنجی صٓ ۵۰)

روایت مذکورۂ بالا ہر پہلو سے قوی معلوم ہوتی ہے، اگرچہ سچے خوابوں سے تمام دنیا کی
تاریخیں بھری پڑی ہیں، اور اس قسم کے معجز نما خوابوں سے کوئی سمجھ رکھنے والا انسان انکار
نہیں کرسکتا تاہم منکروں کا اس طرح اطمینان ہوسکتا ہے کہ سلطان ممدوح بغرض زیارت
مدینہ منورہ گیا ہوگا اور سلاطین کے دستور کے موافق اہل مدینہ کو انعام و اکرام دینے کے لئے طلب
کیا ہوگا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ دو متقی حاجی نہیں آئے ہیں، از راہ عقیدت یا کسی شبہ پر
ان کے حجرے میں چلا گیا ہوگا اور وہاں سرنگ کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی، بہرحال یہ واقعہ
سچ ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۵۵۰ھ ہجری میں حجرۂ شریف کے گرد خندق کھود کر سیسہ
بھر دیا گیا ہے، اور چونکہ یہ کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا اہم اور بڑے مصارف کا تھا اس لئے
غالباً سلطان نے اطمینان کرلیا ہوگا کہ اس سے قبل حجرہ شریف سے جسد اطہر سرور کائنات اور
اجسام حضرت ابوبکر و عمر منتقل نہیں کئے گئے، ورنہ اگر اس کو ذرا سا بھی شبہ ہوجاتا کہ یا کوئی کہانی یا بدایت
اس قسم کی اس بیت تاکہ مصریوں، حلبیوں، یا روضۂ نبوی کے متولی شیعوں نے اجسام کو منتقل کردیا ہے،
تو وہ ہرگز یہ خندق جسے خندق الرصاص یعنی سیسے کی خندق کہتے ہیں نہ بنواتا، اور بے ضرورت
زر کثیر صرف نہ کرتا،

چوتھا واقعہ، محمد ابن جبیر ذیحجہ ۵۷۸ھ کے واقعات تحریر کرتے ہوئے اپنے سفرنامے میں فرماتے ہیں "ہم نے اسکندریہ پہنچکر سب سے اول ایک جماعت کثیر کو دیکھا جو آدمی قیدیوں کو دیکھنے کے واسطے جمع ہوئی تھی، قیدی اونٹوں پر الٹے سوار تھے اور ان کے پیچھے نقارے بجتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے، ان کے حالات سنکر خوف وہراس سے کلیجہ منہ کو آتا تھا، یہ قیدی شام کے نصرانیوں میں سے تھے انھوں نے بحر قلزم[1] کے کنارے کشتیوں کے واسطے تختے بنوالے اور اس سامان کو ہمسایہ عربوں کے اونٹ کرایہ کرکے ساحل تک لے گئے، ساحل سے کشتیاں بناکر دریا میں ڈالیں اور ان میں سوار ہوکر عیذاب[2] میں آئے اور حجاج کی ایک کشتی کو جو جدے آتی تھی لوٹ لیا، اور قافلے میں سے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا، اس کے بعد یمن سے آتے ہوئے سوداگروں کے دو جہاز لوٹ لئے اور ساحل پر امیر مکہ و مدینہ کی جس قدر جنس وغیرہ جمع تھی جلادی غرضکہ ان لوگوں نے اس قدر بدکاریاں اختیار کیں کہ نہ اہل اسلام میں سننے میں آئیں اور نہ رومیوں سے ظہور میں آئیں، سب سے بدتر خباثت اس جماعت کی یہ ہی کہ جس کو کان برداشت نہیں کرسکتے، ان کا قصد تھا کہ مدینے جاکر حضرت سرور کائنات کے جسد مبارک کو ضریح مقدس سے نکال لائیں، یہ تذکرہ ابھی ان کی زبانوں ہی پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بے باکی کا مواخذہ کیا، مدینے سے ان کی ایک دن کی راہ باقی تھی[3] کہ خداوند کریم نے اُن کے شر کو دفع کیا،

---

[1] بحر قلزم افریقہ و عرب کے درمیان واقع ہی جدہ و ینبع اس کے خاص بندرگاہ ہیں، چونکہ اس میں مونگا بکثرت پایا جاتا ہے اس وجہ سے اس کا نام بحر احمر یعنی سرخ سمندر بھی ہے،

[2] عیذاب مصر سے مکے جاتے ہوئے بحر احمر کے کنارے ایک بندرگاہ و قصبہ ہے، یہاں سے جدہ تک دو دن کا راستہ رہ جاتا ہے، کسی زمانے میں دنیا کے مشہور بندرگاہوں میں اس کا شمار تھا اور ہندوستان و چین کے جہاز بکثرت یہاں جاتے تھے،

[3] جہاز یا کشتی کے سفر میں ساحل سے مدینہ منورہ تک ایک دن کی راہ نہیں ہی، مدینے کا بندرگاہ ینبوع ہی یہاں سے خشکی کی پانچ منزل طے کرکے مدینے پہنچتے ہیں غالبًا اس موقع پر ابن جبیر کی مراد یہ ہوگی کہ مدینے کے بندرگاہ تک قزاقوں کی ایک دن کی راہ باقی رہ گئی تھی یا یہ کہ وہ بندرگاہ سے خشکی کے راستے گئے ہوں اور مدینہ ایک منزل رہ گیا ہو،

اصل کیفیت یہ ہو کہ لولو حاجب کی کشتیاں جن میں دیلران مغربی سوار تھے اس گروہ سے دوچار ہوئیں یہ لوگ ڈیڑھ مہینے سے اس جماعت کی تلاش میں تھے اُن کی کشتیاں گھیر لیں بعض کو قتل اور بعض کو گرفتار کیا قیدیوں کی کئی جماعتیں بنا کر بڑے بڑے شہروں میں قتل کے واسطے روانہ کیں اور ان کے سرغنوں کو مکہ معظمہ و مدینہ منورہ قتل کے لئے بھیجا۔

نقلی اجسام کے متعلق برٹن نے اپنے سفرنامے میں حاکم بامر اللہ اور شیعوں کی کوشش کا تو ذکر کیا مگر باوجود سفرنامہ ابن جبیر دیکھنے کے اپنی برادری والوں کا یہ تذکرہ نہیں کیا، شاید اس میں مصلحت یہ ہو کہ آئندہ اس قسم کی کوشش کرنے والے کسی من چلے عیسائی کی ہمت اس قصے کو سن کر پست نہ پڑ جائے،

اعتراض نمبر (۹)

برٹن کہتا ہے:۔ "مجھ کو اس قصے کا بھی یقین نہیں ہو کہ آنحضرت کی قبر کو چکا چوند کرنے والا ایک نور گھیرے ہوئے ہو، یہ روایت زمانہ دراز سے مشہور چلی آرہی ہو اور آج تک بھی حرم نبوی کے خادم اور خوجوں کے بیان پر اس کو صحیح مانا جا رہا ہو، یہ لوگ یقیناً اس کے بے اصل ہونے سے واقف ہیں مگر پادریوں کی طرح قبر کی عدم موجود کے نقص کو چھپانے کے لئے وہ بھی اس کہانی کو دھرائے چلے جا رہے ہیں"

جواب ۔ جو لوگ پابند مذہب ہیں وہ عموماً اور اہل کتاب خصوصاً اس نور کے معجزے سے انکار نہیں کر سکتے، انجیل شریف میں وارد ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مرقد پر سویم کے روز مریم مگدلینی اور دوسری مریم کو برقی روشنی یعنی وہ فرشتہ نور نظر آیا تھا جس کا چہرہ بجلی کا سا تھا[۱] اور جس نے اطلاع دی تھی کہ حضرت مسیح آسمان پر اٹھالئے گئے، پس آنحضرت کی زیارت سے مشرف ہونے والوں کو بھی اگر قبر شریف کے گرد کوئی زبردست نور دکھائی دیتا ہو تو کونسی حیرت کی بات ہے، لیکن حجرۂ شریف جس میں آنحضرت کی قبر مبارک ہو ۱۸۹۰ء سے چاروں طرف سے بند ہو،

---

[۱] انجیل متی باب ۲۸

اور جب سے اب تک گویا اس میں کوئی داخل ہی نہ ہوا بجز دو ایک موقعوں کے[1] خدام مقبرہ
بھی صرف اس بیرونی جالی کے اندر داخل ہو سکتے ہیں جو حجرہ شریف کے گرد بنی ہوی ہے،
غرضکہ قبر شریف ایک ایسی قبر ہے جو ہمیشہ کے لئے ہر شخص کی نظر سے پنہاں ہے اور سینکڑوں
برس سے اس وقت تک کسی کا گزر نہیں ہوا ہے، اور آج تک بھی وہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے
پس جو چیز کہ نظر نہ آے، اس کی روشنی و نور کے بارے میں شبہ کرنا اور اس شبہ کو قبر کی عدم موجودگی
کی دلیل ٹھہرانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حجرہ شریف میں اگر کوئی دروازہ ہوتا،
اور خادموں کے سوا حجرے میں کوئی دوسرا داخل نہ ہونے پاتا تو البتہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان کو
سب معلوم ہے کہ قبر کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے مگر پادریوں کی طرح اس نقص کو چھپانے کے لئے
یہ مشہور کر رکھا ہے کہ "قبر شریف کے گرد ایسا زبردست نور ہے کہ اگر کوئی دیکھ لے تو اس کی
بصارت جاتی رہے" تاکہ لوگ ڈر کر اندر جانے کا خیال بھی نہ کریں، مگر حجرہ شریف میں کوئی
دروازہ نہیں ہے اور خادم و متولی بھی روشنی و صفائی کے لئے صرف بیرونی جالی کے اندر
جا سکتے ہیں، اصل حجرہ جس میں قبر ہے ان کے لئے بھی قطعاً بند ہے، اور اسی وجہ سے یہاں کے
خادموں کو کسی عیب کے چھپانے کے لئے شعبدہ بازی کے وہ موقعے حاصل نہیں ہیں، جو
بیت المقدس اور بعض دوسرے گرجوں کے پادریوں کو حاصل ہیں[2]،

---

[1] سنہ ۹۰ ہجری کے بعد سے صرف دو تین مرتبہ دو ایک آدمیوں کو حجرۂ شریف میں باریابی کا شرف حاصل ہوا ہے، ایک مرتبہ سنہ ۵۴۸ھ میں حجرۂ شریف کے اندر کوئی آواز چھت سے مٹی کے گرنے کی سنائی دی تھی، اس کی صفائی کے لئے ایک صالح و متقی بزرگ کو دیوار میں روزن کر کے حجرہ شریف کے اندر اتارا تھا اور اسی سال ایک دفعہ اور اسی قسم کی ضرورت سے ایک خادم اور ایک متولی کو حجرے میں داخل ہونے کی ضرورت ہوی تھی اس کے بعد سنہ ۸۸۱ ہجری میں سلطان مصر قائتبائی نے جب مسجد نبوی کی مرمت کرائی تو اس وقت معدودے چند بزرگوں کو یہ شرف حاصل ہوا تھا منجملہ ان کے سید سمہودی مورخ مدینہ بھی تھے، (تاریخ سمہودی)

[2] پادریوں کے فریب کی مثال میں ہم اس جگہ صرف اس شعبدے کی کیفیت ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کر کے لکھتے ہیں جو وہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر چلے جانے کی تقریب میں کلیسا بیت المقدس

اب ایک اور پہلو سے بھی ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں، مشاہدۂ نور کا تعلق عقائد و تصورات سے ہے،

(بقیہ صفحہ گزشتہ) میں دکھاتے ہیں:۔

"ان تمام بدمعاشیوں اور فریبوں کے علاوہ جو بیت المقدس کے راہب و پادری ہر سال دکھاتے ہیں ایک وہ شعبدہ ہے جو مزار شریف (قبر مسیح) کے کلیسا میں ایسٹر عید (یوم صعود مسیح) کی شام کو کیا جاتا ہے، یہ دھوکہ دوسری تمام بیہودگیوں سے سبقت لے گیا ہے، سالہائے دراز سے آج تک خدا کا گھر اس کا خزانہ فریب سے ناپاک کیا جاتا ہے، اور اس کا نام مقدس "آگ کا معجزہ" رکھا گیا ہے، اس روز صبح ہی سے کلیسا میں عیسائیوں کے جم غفیر اکھٹے ہو جاتے ہیں، صرف تھوڑی جگہ ترکی سپاہیوں کی دو قطاروں کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے، دو پہر تک زائرین کا مجمع بڑھتا جاتا ہے اور غول کے غول اس جمگھٹ میں شریک ہو کر دیوانہ وار قبر کے گرد ناچتے، تالیاں بجاتے، اچھلتے کودتے وحشیانہ آوازیں نکالتے چیخیں لیتے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ ٹیک ٹیک کے اچکتے ہوئے چکر لگاتے ہیں، اس کے بعد دفعتاً امن صاف ہو جاتا ہے اور ایک زرق برق جلوس ہاتھوں میں زر دوزی کی جھنڈیاں لئے ہوئے ادھر سے ادھر تین مرتبہ گزرتا ہے اور ان کے ساتھ پادریوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اپنے حلقے میں "آگ والے" بڑے پادری کو لئے ہوئے لوگوں کو چیرتا ہوا تا کلیسا کے دروازے تک پہنچتا ہے، دروازے میں اس پادری کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو جاتا ہے، کلیسا کی بڑی دیوار میں ایک سوراخ ہے یہاں ایک پادری کھڑا رہتا ہے اور اس جگہ سے لیکر گرجے کی دیوار تک اس مجمع کے بیچ میں آدمیوں کو ہٹا ہٹا کر ایک تیلی گلی سی بنا لیتے ہیں، یہ وقت بڑے تاؤ کا ہوتا ہے بعد ہر زائر کا جوش و جذبہ انتہائی درجہ کو پہنچ جاتا ہے یکایک ایک چمکدار شعلہ سوراخ میں سے نظر آتا ہے، پادری اپنی مشعل اس سے روشن کرتا ہے اور پھر اس آگ تک پہنچنے کیلئے چاروں طرف سے ہلہ ہوتا ہے آدمی پر آدمی ٹوٹتا ہے اور زائر پر زائر گرتا ہے، ہر شخص اس مشعل سے اپنی مشعل روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ہزار ہا موم بتیاں اور مشعلیں روشن ہو جاتی ہیں اس کے بعد دھوئیں اور گرمی سے بچنے کے لئے ہر شخص بادلوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر دیوانوں کا یہ مجمع اپنے اپنے گھروں کو لوٹتا ہے، اور سارے شہر میں یہ تبرک آگ لئے پھرتا ہے، پیشتر عیسائیوں کے تمام فرقے اس رسم میں شریک ہوا کرتے تھے لیکن جب رومی عیسائیوں نے یونانیوں کو الگ

قبر شریف و مرقد منیف تو بہت بڑی چیز ہے، شیفتگان جمال محمدی و مشتاقان نور احمدی، مدینہ منورہ کے در و دیوار و شجر و حجر میں وہ وہ انوار و تجلیات مشاہدہ کرتے ہیں کہ اغیار ان کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

ذوق ایں بادہ ندانی بہ خدا تا نہ چشی

اگر کسی مسجد یا معبد میں کوئی شخص خدا کے جلال و جبروت کا تصور کر کے کانپنے اور تھرانے لگے تو کیا اس کی دہشت و ہیبت کو فرضی ڈھکوسلا کہیں گے؟ بادہ کشان ساغر محبت پر جو حالت و کیفیت آستانہ مبارک کی حاضری میں پیدا ہوتی ہے، اور عاشقان رسول اللہ پر جو عالم وجد حضوری دربار پر انوار کے وقت طاری ہوتا ہے، اس سے ایک نور تو کیا عرش سے فرش تک سب بقعہ نور ہی نظر آتا ہے، اہل دل ان فریفتگان دیدار کی دلی کیفیت کا اندازہ کر کے اس نور یا روشنی کو ہرگز بے اصل نہیں کہہ سکتے البتہ بدبین[1] و کور باطن اشخاص کو رکے

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ گزشتہ) گرجے سے خارج کر دیا، اور اس فریب سے فائدہ اٹھانے کا ان کو موقعہ نہ رہا تو وہ ایسے دھوکے اور مکاری سے تعبیر کرنے لگے، اور اب صرف یہاں کے پادری اور ضعیف الاعتقاد زایر یہ خیال کرتے ہیں کہ روح القدس آگ کی شکل میں اس قبر مبارک پر نازل ہوتی ہے جو [illegible] روشن کر کے باہر پہنچا دی جاتی ہے تو آگ والا پادری جو فی الحقیقت [illegible] روشن کر دیتا ہے، لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ایک مصنوعی وجد و بے ہوشی کی حالت میں باہر نکلتا ہے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت نے جس کے بارگاہ سے وہ ابھی ابھی چلا آرہا ہے اس پر ایک خاص کیفیت طاری کر دی ہے، یونانی عیسائیوں کو اس فریب سے بڑے بڑے فائدے ہیں، تمام دنیا کے عیسائی اس معجزے سے مشرف ہونے کے لئے دور دراز ملکوں سے بیت المقدس کھچے چلے آتے ہیں فقط (سینیز ان پیلسٹائن (مناظر فلسطین) مرتبہ ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۱۱۲)

[1] یہاں برٹن کی بدبینی کی طرف اشارہ ہے جس کی صراحت اس نے اپنے سفرنامے میں جبل عرفات کے ذکر میں کی ہے اور جبکہ عین خطبہ کے وقت اس کے چاروں طرف ہزاروں حاجی اپنے گناہوں

معنی بھی نہیں سمجھتا وہ کیا جانیں کہ مرقد انور، روضہ پرنور اور مدینہ منورہ کسے کہتے ہیں؟
یقین نہ آئے تو کسی اردو جاننے والے عیسائی سے اس درویش کی نظم "مدینے کی چاندنی"
کے اس بند کا مطلب دریافت فرما لیجئے، امتحان ہو جائے گا۔

ندی چڑھاؤ پر ہے شراب طہور کی ۔ مے نوش لا رہے ہیں خبر دور دور کی
کیا دیکھے کوئی روشنی اب شمع طور کی ۔ جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینے میں نور کی

چھٹکی ہلال گنبد خضرا کی چاندنی
پھیکی پڑے نہ کیوں ید بیضا کی چاندنی

غیروں کو کیا معلوم کہ شبیر اس وقت عالم خیال میں مدینہ منورہ پہنچ گیا ہے اور چاندنی
رات میں روضہ رسول اللہ کا سنہری ہلال دیکھ کر مدینے نور میں شناوری کر رہا ہے۔

جَلَّ جَلَالُہٗ ۔۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پریشان ہو کر زار زار رو رہے تھے برٹن ایک عورت کو چھیڑنے میں مصروف
تھا، کاش اس نے انجیل شریف کی یہ آیت غور سے پڑھی ہوتی "اگر تیری آنکھ تجھے ٹھوکر
کھلائے تو اسے نکال ڈال اور پھینکدے، خدا کی بادشاہت میں کانا داخل ہونا تیرے لئے
اس سے بہتر ہے کہ دو آنکھیں رکھتے ہوئے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے۔"
(انجیل مرقس باب (۹) آیت (۴۷)

اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلام

مشکل ہی بہت صاحب ایماں ہونا کچھ کھیل نہیں ہے حق پہ قرباں ہونا
یاں مثل حسینؑ سر قلم ہوتا ہے امجد آساں نہیں مسلماں ہونا

وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللّٰہ

گرچہ امجد سخت نافرجام ہے کام لینا اس سے تیرا کام ہے
کامیابی کے نہیں ہم ذمہ دار کام کی حد تک ہمارا کام ہے
جبر اس مختار پر کیوں کر کریں عرض کر دینا ہمارا کام ہے

سید احمد حسین امجد

حیاتِ تمدن

محمد تغلق اور اُس کی سوء تدبیری
شیرازۂ حکومت کا بکھر جانا
بیجانگر راج اور سلطنت بہمنی کا قیام

جس وقت محمد تغلق نے تخت دہلی پر قدم رکھا ہے تو اس وقت دہلی کا فرمان پشاور سے لیکر راس کماری تک نافذ تھا،

سلطنت کی اس وسعت نے محمد تغلق کو یہ سوجھایا کہ دہلی کا پایہ تخت رہنا اسی وقت تک موزوں تھا جب تک کہ شمالی ہند میں اسلامی عملداری تھی، اب جبکہ جنوبی ہند بھی اسلامی عملداری میں داخل ہو گیا ہے تو دہلی کے عوض دیوگیر (بنام دولت آباد) دار السلطنت بننے کے قابل ہے جو تقریباً وسط ہند ہے[۱] اس خیال کی تحریک اس طرح ہوئی کہ بہاء الدین گستاسب محمد تغلق کے بھانجے نے جو ساغر (ساگر) اور دولت آباد کا صوبہ دار تھا، محمد تغلق کی ماتحتی ناپسند کرکے خودمختاری کا جھنڈا بلند کر دیا، اور جب شاہی فوج کو بمقام دیوگیر دو دفعہ شکست دینے کے بعد بالآخر ناکام رہا، اور کنبلیہ واقع کرناٹک (یہ راج اس مقام پر تھا جہاں اس کے قریب ہی زمانے میں بیجانگر کا نیا راج قائم ہوا عجائب الاسفار صفحہ ۱۵۶) کے راجا کے پاس پناہ لی[۲] تو محمد تغلق

[۱] محمد تغلق کے سامنے ہی شیرازۂ حکومت منتشر ہو گیا، آیندہ چل کر دوسری بار جب پھر اسلامی مغلیہ امپائر کے حدود بھی اسی قدر وسیع ہو گئے تو یہی ماجرا نظر آتا ہے کہ عالمگیر بھی سواد دولت آباد میں عمر بسر کر دیتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد تغلق کی رائے محض الہام نہ تھی ایک حد تک اسمیں واقعیت کا پہلو تھا لیکن دار السلطنت سے اہم چیز خود بادشاہ کا کیرکٹر ہے،

[۲] پیشتر حجاج بن یوسف نیز منصور کے زمانے میں عربوں حتیٰ کہ سادات نے بھی عرب و عراق سے بھاگ کر ہندو راجاؤں کے پاس پناہ لی تھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ۱۲

بذات خود دیوگیر آیا، کنبلہ کا راجہ گرفتار ہوا، کہا جاتا ہے کہ راجا مع اقربا چتا میں جل گیا لیکن ابن بطوطہ اس کی اولاد کے مسلمان ہوجانے کا حال لکھتا ہے اور تین بیٹوں کے نام بھی بتلاتے ہیں جن سے اس کی دہلی میں ملاقات تھی، اور جب گستاسپ وہاں سے بھاگ کر بلال دیو (راجہ میسور) کے پاس گیا تو اس نے محمد تغلق کے ڈر سے اس کو گرفتار کرکے بھیجدیا، گستاسپ کا پوست چھیلا گیا، غرض محمد تغلق نے دیوگیر کو دولت آباد کے نام سے دارالسلطنت قرار دیا، اس مقصد کے لئے اس نے کثیر رقم صرف کی، دہلی سے دولت آباد تک نہایت عمدہ سڑک تیار ہوئی دورویہ درخت، ہر منزل پر سرائے، ابن بطوطہ جس نے اس سڑک پر دہلی سے دولت آباد سفر کیا، لکھتا ہے کہ "دولت آباد دہلی سے ۴۰ منزل ہے، تمام راستہ پر بیدمجنوں اور قسم قسم کے درخت دورویہ لگے ہوئے ہیں، چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جارہا ہے، ہر ایک کوس میں تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی ہیں، ہر چوکی پر ہر چیز جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے ملتی ہے، گویا وہ بازار میں جارہا ہے اسی طرح سے یہ سڑک تلنگانہ اور معبر کے ملک تک چلی گئی ہے" (عجائب الاسفار صفحہ ۴۲) ابن بطوطہ نے جو حالت درختوں کی بیان کی ہے اس کے لحاظ سے مجھے یہ قیاس کرنے میں تامل نہیں ہے کہ سڑکوں کی تعمیر بھی علاء الدین کا کارنامہ ہے، جس طرح اس کے اور کارنامے مابعد اشخاص کی طرف منسوب ہوگئے ہیں، اس طرح یہ کارنامہ بھی دوسروں کی طرف منسوب ہوگیا،

ابن بطوطہ نے اس سڑک کا ذکر قطب الدین خلجی کے سفر دولت آباد کے ضمن میں کیا ہے، جس طور سے اس نے لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ سڑک قطب الدین کے وقت میں ہی موجود تھی، اگر یہ کارنامہ خاص محمد تغلق کا ہوتا تو بوجہ قرب عہد وہ ضرور صراحت سے لکھتا، دولت آباد نئی نئی عمارتوں، باغات حوضوں کی وجہ سے ایک نیا اسلامی شہر بقول ابن بطوطہ "دہلی ثانی" بن گیا، حسب تحریر یحییٰ ناروابن شفیق (عہد آصفی) الورہ تک باغات کا سلسلہ تھا چند ہی سال کے بعد پھر دہلی آباد ہوئی اور دولت آباد تخت گاہ نہ رہا، (۲۱) سال دولت آباد

پائے تخت رہا تھا،

فوجیں کس کام میں لگائی جائیں؟

محمد غوری نے جو لہر پنجاب سے دوڑانی شروع کی تھی اسی کو علاء الدین خلجی نے راس کماری تک پہنچا دیا تھا اور جو کچھ کمی رہ گئی وہ اب پوری ہو چکی تھی، ربع صدی کے اندر اندر جنوبی ہند بھی شمالی ہند کے ساتھ اسلامی سلطنت میں شریک تھا، اب پھر وہی سوال درپیش تھا کہ فوجیں کس کام میں لگائی جائیں؟ ہندوستان میں کوئی کام باقی نہ رہا تھا، غیر مسلم مغلوں کی حملہ آوری بھی نابود ہو چکی تھی، بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ ہندوستان سے باہر پیشقدمی ہو۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے لئے جو راستہ تجویز کیا تھا اب اس کی نوبت آئی، چنانچہ براہ تبت چین کی مہم آغاز کی گئی لیکن یہ شاندار مہم ناتجربہ کاری کی وجہ سے بالکلیہ ناکام رہی، ایک لاکھ کی فوج کا غارت ہونا معمولی واقعہ نہ تھا اور اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت اسلامی ہند کا شیرازہ بکھر گیا اور بجائے کسی کمزور جانشین کے وقت میں ہونے کے اس کی زندگی میں ہی خود مختار فرماں روا قائم ہو گئے جس کی بڑی وجہ حسب تصریح ضیا برنی اس کی سوء تدبیری اور ناروا سخت گیری تھی، ایک خود مختار بادشاہ کی سوء تدبیری کے جو نتائج ہوتے ہیں وہ فوراً پیدا ہو گئے، بنگالہ تو مہم چین کے پیشتر ہی تخت دہلی کے اقتدار سے خارج ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے مہم چین کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ناموزوں راستہ اختیار کرنا پڑا تھا، اب مہم چین کی ناکامی کے بعد مسلسل خود مختاریوں کا سلسلہ جاری ہو گیا، معبر (کارومنڈل یا صوبہ مدراس) کا صوبہ دار سید جلال الدین[1] احسن خود مختار بن گیا، اس کے مطیع کرنے کے لئے خود اس نے معبر کا رخ کیا، ورنگل تک پہنچنے کے بعد وہاں سخت وبا تھی جس میں خود بادشاہ سخت بیمار ہو گیا اور مجبوراً چند امرا کو وہاں چھوڑ کر اسے واپس آنا پڑا، اس طرح معبر خود مختار ہو گیا اور مدورہ واقع جنوبی ہند میں اسلامی ریاست مستقلاً قائم ہو گئی، مرہٹواڑی

---

[1] یہ سادات کیتھل سے تھا، جنھیں ضیا برنی کے مطبوعہ نسخہ میں "سادات نومتہ" لکھا ہو لیکن فرشتہ میں سادات نوایتہ درج ہے۔

اور تلنگانے کے دو صوبوں میں سے مرہٹواڑی کا صوبہ دار قتلغ خاں بادشاہ کا استاد مقرر ہوا، اور تلنگانہ کا نصرت خاں جس نے اس صوبے کا ایک کروڑ ٹنکہ[۱] پر سہ سالہ تعہد لیا، تعہد داری طریقہ کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، اس تعہد داری طریقے کی ضرورت مالی خراب حالت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، محمد تغلق کی مسرفانہ داد و دہش (اس وقت کی اسلامی دنیا کا سلطان بننے کی ہوس میں شاندار تجاویز، تبدیل دار السلطنت، جہاں گیری خزانے سے ہل من مزید کا مطالبہ کر رہی تھیں، کوئی نیا ملک فتح نہیں ہوا، جس سے جدید آمدنی کی صورت پیدا ہوتی، قدرت کی طرف سے بار بار قحط کا دورہ ہوا، غرض محمد تغلق نے ہر جگہ مزید محاصل کا مطالبہ شروع کیا، چنانچہ مرہٹواڑی میں بھی خود سرکاری محصل مقرر کئے (ضیاء برنی ص ۴۸۱)

نصرت خاں نے بڑی جراءت کر کے اس قدر رقم کا تعہد لے لیا تھا جس کا بہ لحاظ حالات حاصل ہونا ممکن نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود کمال کفایت شعاری، اور انتظام کے تہائی چوتھائی رقم تعہد بھی وہ پیش نہ کر سکا اور چونکہ انجام معلوم تھا لہذا خود مختار بن گیا، اس کی اصلاح کے لئے قتلغ خاں بھیجا گیا جس نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا، لیکن انتظام کی کل بگڑ گئی تھی، ایک فتنہ دبا تھا تو دوسرا سر اٹھاتا، علی شاہ (حسن بہمنی بانی خاندان بہمنی) بڑا بھائی جو قتلغ خاں کا ایک ماتحت امیر صدہ تھا گلبرگہ و بیدر پر قبضہ جما کر خود سر ہو گیا، اس کی اصلاح کے لئے بھی قتلغ خاں بھیجا گیا جس نے علی شاہ کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا، جو اپنے وطن غور میں جلا وطن کیا گیا، واپس آنے کی کوشش کرتے ہوئے مار ڈالا گیا۔

قتلغ خاں | یہ قتلغ خاں، صوبہ دار دکن اسلامی تاریخ دکن میں ممتاز درجہ رکھتا ہے، جس طرح ضیاء برنی اس کے اوصاف کا مدح سرا ہے، ابن بطوطہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے، "وہ پابندی عہد میں مشہور تھا اور لوگ اس کے قول پر بھروسہ کرتے تھے، اس کے رفاہ عام کے کام یادگار ہیں، دولت آباد کا حوض قتلو اسی کا یادگار ہے" در عدالت و حسن سلوک عدیل

---

[۱] ٹنکہ کے متعلق مولوی محمد حسین نے تفصیلی تحقیقات کی ہیں، حاصل یہ کہ "روپیہ" کا استعمال شیر شاہ کے زمانہ سے پہلے ٹنکہ مروج تھا، کم و بیش اس کو اس زمانہ کا روپیہ کہنا چاہیے۔

بطلیموں داشت" دکن کے (۲۳) صوبے اول اسی سنے قرار دئے، محمد تغلق کے شور پل من مزید نے
اب کل دکن کا تعہد چھ سات کروڑ تنکہ پر دینا چاہا چنانچہ اس کام کے لئے نئے عہدہ دار
بھیجے گئے، قتلغ خاں اس بنا پر کہ اس نے محاصل گھٹائے ہیں، واپس بلا لیا گیا۔ اس کی
نیک نیتی کا اندازہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جاتے جاتے بھی اپنے بھائی نظام الدین
کو جو اس کی جگہ منصرم مقرر ہوا تھا، حوض قتلو کی تکمیل کی ہدایت کرتا گیا، جو اس وقت زیر تعمیر
تھا، برنی لکھتا ہے کہ "ایں معنے عقلا را مقرر بود کہ خلق دیوگیر کہ بر قرار ماندہ است بواسطہ
مسلمانی و دیانت و عدل و احسان و مہر و شفقت قتلغ خاں ماندہ است، آنجائیاں از ہندو
و مسلمان از استماع بسیاری سیاست بادشاہی متنفر گشتند"

محمد تغلق کو بجز زیادہ ستانی اور سخت گیری کے کچھ سوجھتا نہ تھا اس نے دکن کے
تمام امرائے صدہ کے قتل کے احکام جاری کئے چنانچہ ایک ہی روز میں (۸۰) امرائے صدہ قتل کئے گئے،
اس حماقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ باقی امراء کو حفاظت خود اختیاری کا سلسلہ آغاز کرنا پڑا چنانچہ ان امرائے
جن کو ابتدائی دور کے لئے جاگیردار کہنا چاہیے، مخ افغان برادر ملک مل افغان کو باتفاق بصالح
حفاظت اپنا رئیس بہ لقب ناصر الدین مقرر کیا جو گویا سینیر (دیرینہ سال) امیر تھا، نور الدین
ہروی وزیر، اور حسن شاہ بہ خطاب ظفر خاں، بانی خاندان بہمنی، امیر الامراء یا سپہ سالار، غیاث الدین تغلق
کو تخت دہلی اسی طرح امرائے دربار کے اتفاق سے ہی ملا تھا، اور محمد تغلق کی سوء تدبیری
اور سخت گیری سے امراء دکن کو بھی اس کے سوا چارہ نہ تھا، یہ خبر سنکر محمد تغلق بھڑوچ سے،
جہاں وہ اس علاقہ کی بغاوت کا انتظام کر رہا تھا، دولت آباد اپنی زندگی میں آخری دفعہ
پہنچا، شاہی فوج سے مقابلہ دشوار تھا لہذا حسن شاہ کی رائے کے مطابق مخ افغان دھاراگڑھ
کے قلعے میں چلا گیا، حسن وغیرہ اپنی اپنی جاگیروں میں چلے گئے، بادشاہ نے عماد الملک تبریز
اپنے داماد کو گلبرگہ بھیجا کہ وہاں حسن وغیرہ کو گرفتار کرے، ابھی بادشاہ یہاں مصروف انتظام
ہی تھے کہ گجرات سے طغا کے بغاوت کی خبر پہنچی لہذا اس نے پھر بھڑوچ کا قصد کیا،

اس کے جاتے ہی حسن نے عماد الملک پر حملہ کر کے اس کو مار ڈالا۔ دولت آباد میں جو شاہی
نئے افسر تھے وہ خود بھاگ کر واپس چلے گئے، حسن اور مخ وغیرہ سب امرائے دکن اب پھر
دولت آباد میں جمع ہوئے، اس عرصہ مدت میں حسن ظفر خاں ہی اصلی لیڈر رہا تھا،
مخ بنجر سینیارٹی کے وہ عملی قابلیت نہیں رکھتا تھا جو ظفر خاں کی ثابت ہوئی تھی، امرا
سب حسن کے ہی گرویدہ تھے، لامحالہ ناصرالدین نے خود استعفا دے دیا، اور اب حسن کا انتخاب
ریاست کے لئے عمل میں آیا، جس نے علاء الدین کے لقب سے علاء الدین اول کی یاد تازہ
کر دی اور سلطنت بہمنی کی بنا ڈالی، لیکن اس جدید اسلامی ریاست کا اقتدار ابتداءً صرف مہاراشٹر
اور کسی قدر کنڑی علاقے تک محدود تھا کیونکہ جنوبی ہند میں تو الگ مستقل ریاست جلال الدین احسن
نے قائم کر لی تھی، اور دونوں کے بیچ میں ایک نیا راج بیجانگر قائم ہو گیا تھا، اور ورنگل
میں بھی سابقہ حالت عود کر آئی تھی،

ورنگل اور بیجانگر

شہاب الدین غوری بلکہ محمود غزنوی بلکہ محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر
اس وقت تک سندھ، پنجاب، شمالی ہند میں ہر جگہ یہ ایک عام کلیہ ہے، کہ نئی حکومت کے
بعد پھر پرانا نقشہ کہیں نظر نہیں آتا، لیکن اس عام کلیہ کے برعکس ورنگل و بیجانگر میں سابقہ
نقشے کا قیام بظاہر تعجب خیز معلوم ہوگا، وہی مشیت ایزدی تھی جس نے محمد بن قاسم کو تقدیری
سے روک دیا تھا اس کے اسباب مہیا کرنے والی تھی۔

رام دیو راجہ دیوگری کے ساتھ جو سلوک علاء الدین خلجی نے کیا تھا یعنی بطور باج گزار حکومت کے
اس کا بحال رکھنا، وہی سلوک رودر دیو راجہ ورنگل کے ساتھ غیاث الدین تغلق نے کیا تھا،
مولوی بشیر الدین احمد نے لکھا ہے "چند روز کے بعد اس کو ورنگل آنے کی اجازت مل گئی،
اور وہ مرتے دم تک بادشاہ کا مطیع و فرمانبردار رہا، (تاریخ بیجانگر صفحہ ۲۰) رودر دیو کے بعد
اس کا بیٹا کرشنا نائک جانشین ہوا، جو حسب تحریر فرشتہ نواح ورنگل میں ہی رہتا تھا، جس طرح
رام دیو کے بعد اس کے جانشینوں نے آزادی کی ہوس کی تھی، اسی طرح یہاں بھی ہوا،

یلمن اول الذکر کوشش ایسے زمانے میں ہوئی، جبکہ تقدیر ناساعد تھی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ
راج ہی معدوم ہو گیا، لیکن یہاں ورنگل کی کوشش کو زمانہ مساعد ہوا،

ضیاء برنی لکھتا ہے "در ورنگل فتنۂ ہنود برخاست و کنیا نائک در ان دیار
سر برآورد، و ملک مقبول نائب وزیر از ورنگل براہ شہر (دہلی) گرفت و بسلامت در دہلی
رسید، و ورنگل را ہندوان فرو گرفتند و آں دیار بکلی از دست رفت، و ہم درال ایام
شخصے از اقربا رکنیا (کشنا) کہ سلطان محمد در کنبیلہ فرستادہ بود، آں بدبخت از اسلام گشتہ
و مرتد گشت و بغی ورزاید و عرصہ کنبیلہ ہم از دست رفت، و بدست ہندوان افتاد و ہماں
مرتدان را فرو گرفت و بحر دیو گیر و گجرات در ضبط نماند، و در ہر طرفے تخلل و تشتت زاید" ص ۴۸۴

اس عبارت میں تین اشخاص کا نام آیا ہے، (۱) کشنا نائک، (۲) ملک مقبول (۳) حاکم کنبیلہ

ان میں مقبول کی نسبت عجائب الاسفار میں درج ہے "یہ شخص در اصل تلنگانے کا رہنے والا تھا،
اور وہاں کے راجہ کا کوئی بڑا اہلکار تھا" شمس سراج عفیف نے لکھا ہے کہ مسلمان ہونے سے
پہلے اس کا نام کٹو تھا، جب وہ راے تلنگانہ کے ساتھ دہلی آیا تو مسلمان ہو گیا، بادشاہ نے
مقبول اس کا نام رکھا، یہ شخص فارسی پڑھا ہوا نہیں تھا لیکن بہت ہوشیار و منتظم آدمی تھا" ص ۱۹۶

الغرض ملک مقبول مسلمان ہی رہا، اور گجرات وغیرہ کی مہموں میں بھی اس کا نام آیا ہے۔

(۲) کشنا نائک کے متعلق فرشتہ نے صراحت کی ہے کہ اس نے میسور کے راجا سے
مدد حاصل کی، اور اسی کی امدادی فوج سے وہ ورنگل پر مکرر قبضہ حاصل کر سکا، ضیاء برنی نے
تصریح نہیں کی کہ کشنا نائک بھی مسلمان ہو گیا تھا، مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں "کشنا
مسلمان ہو گیا تھا لیکن آگے چل کر اسلام سے منحرف ہو گیا" تاریخ بیجاپور ضمیمہ ورنگل ص ۵۹۶
اگرچہ کسی کتاب کا حوالہ نہیں ہے لیکن کسی ماخذ سے ہی لکھا گیا ہوگا، بہرصورت کشنا نائک نے
ورنگل راج پھر قائم کر دیا،

(۳) اب اس تیسرے شخص کی تحقیق کرنی ہے جس کا ضیاء برنی نے اقربا کشنا نائک سے

ہوا اور اس کا حاکم کنبیلہ بنایا جاتا، اور پھر اس کے معتمد ہونے کی تصریح کی ہے ضیاء برنی نے اس کا کوئی نام نہیں لکھا، لیکن یہ مسلم ہے کہ بیجانگر راج کا بانی "ہری ہر" ہے،

بیجانگر راج کے قیام کی جو تاریخ افسانوں کی تحلیل و تحقیقات کے بعد پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ ہری ہر اور اس کا بھائی دونوں کروبا ذات سے تعلق رکھتے، اور ورنگل کے راجا کے پاس ملازم تھے، ورنگل فتح ہونے کے بعد دونوں بھائی اناگندی (کنبیلہ) چلے آئے اور یہاں وہ ملازم ہوئے اور حسن کارگزاری سے وزیر اور خزانچی کے عہدوں تک پہنچ چکے، جب راجا نے گشتاسب کو پناہ دی، اور اس کے بعد محمد تغلق کا اناگندی پر قبضہ ہو گیا تو دونوں بھائی بھی اس کے ساتھ دہلی گئے، وہاں سے محمد تغلق نے پھر ہری ہر کو صوبہ دار کنبیلہ بنا کر بھیجا، اس واقعہ کو پرتگالی سیاح نونیز نے بھی لکھا ہے، جو بیجانگر میں کرشن دیو کے زمانے میں آیا تھا، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ واقعہ زبان زد خلائق تھا (تاریخ بیجانگر صفحہ ۳۴) اس طرح قدرت نے ہری ہر کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا، چونکہ اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی پائی تھی، اور زمانے کی رفتار پر بخوبی نظر ڈالی تھی، دہلی کا تہذیب و تمدن بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی، دونوں سوسائیٹیوں سے اس کو پورا سابقہ پڑ چکا تھا، اس لئے یہ امر اس کے لئے آسان ہو گیا کہ پرانا راج جدید رنگ میں تازہ کر دے، مسلمان ہو کر پھر اس کا ارتداد بحث طلب ہو لیکن یہ مسلم ہے کہ اس زمانے کے عام لوگوں سے اس کا عقیدہ بالکل مختلف اور وہ توحید کا قائل تھا،

نواب سر امین جنگ بہادر بالقابہم کا قابل قدر مضمون جو رسالہ ترقی حیدر آباد میں شائع ہو چکا ہے، اس میں اچھی طرح بتایا گیا ہے کہ مسئلہ توحید نے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً کیا رنگ بدلے سری شنکر اچاری نے توحید کی تعبیر وحدۃ الوجود سے کی ("لاموجود الاہو") اس مسئلہ وحدۃ الوجود نے بتدریج اہل ہند کو مبدء توحید سے بہت دور کر دیا تھا، اور جس وقت ہندوستان میں اسلام آیا تو ویدانت اور سری شنکر اچاری کی تعلیم "نسیاً منسیاً" ہو چکی تھی سو اہل ہندوستان میں

میلادِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از
(مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر مترجم عثمانیہ عدالت العالیہ)

آج وہ دن ہے کہ جنت کی ہوائیں آئیں　　عرشِ اعلیٰ سے سلامی کی صدائیں آئیں
کوہِ رحمت[1] پہ گرجتے ہوئے بادل اٹھیں　　جبلِ نور[2] سے گھنگھور گھٹائیں آئیں
چرخ سے صلِ علیٰ کہتے ملائک اتریں　　حوریں اب راگ شہانہ کوئی گائیں آئیں
جا بجا شربتِ کوثر کی سبیلیں رضواں　　چمنِ گلشنِ ہستی میں لگائیں آئیں
خانہ کعبہ میں اب ڈھا دیں بتوں کو جبریل　　علمِ سبز خضر لا کے چڑھائیں آئیں
خلد سے اٹھیں نسیمِ سحری کے جھونکے　　شعلۂ آتشِ زرتشت بجھائیں آئیں
کاخِ کسریٰ نے بھی سر خوب ابھار رکھا ہے　　اس کو عمّالِ قضا نیچا دکھائیں آئیں
مجلس آراستہ اس وقت فرشتے کر دیں　　فرش آنکھوں کا سرِ راہ بچھائیں آئیں
زینت افزائے دو عالم سرِ بزم آتا ہے　　قدسی اب مسندِ اقبال بچھائیں آئیں
اب ظہورِ شہِ بطحیٰ ہے، نبی و مرسل　　انکی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائیں آئیں
کعبۂ امن و اماں آتے ہیں اب جن و بشر　　اپنی آنکھوں سے قدم انکے لگائیں آئیں
قبلۂ کون و مکاں، احمدِ ذیشاں آئے　　انبیا اب سرِ تسلیم جھکائیں آئیں
لائے ہیں سرورِ کونین محمد تشریف　　مرسلیں نعرۂ تکبیر لگائیں آئیں
قابلِ دید یہ محفل ہے و لیکن شبیر　　کیسے ہم دیکھیں؟ جو سرکار بلائیں آئیں
اپنے مشتاقوں کو اب دید و اجازت شاہا　　کہ یہ عاصی بھی جو آتے ہیں تو آئیں آئیں

---

[1] کوہِ رحمت مکے سے جانب مشرق کوئی نو کوس جبلِ عرفات کے دامن میں تین سو فٹ بلند ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اس کی چوٹی پر ایک سفید ستون بنا ہوا ہے جہاں امام اونٹ پر سوار ہو کر خطبۂ حج پڑھتا ہے۔

[2] جبلِ نور مکے سے ڈھائی میل عرفات کی سڑک پر ایک پہاڑ ہے جس کی بلندی ایک میل ہوگی۔ یہ وہ مقام ہے کہ آنحضرتؐ قبل نبوت یہاں عبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے اسی پہاڑ پر شق صدر ہوا تھا اور پہلی وحی یہیں نازل ہوئی تھی

"تنہائی کا گیت"

(از مولوی سید وحید احمد صاحب وحید)

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!

سیج پہ میرے پھول پڑے ہیں لیکن وہ ہیں انگارے　　لیٹی تڑپی بیٹھی اٹھی آگ لگی تن میں سارے

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!

تنہائی میں صبر کی گھڑیاں بہت کٹھن ہیں آقا　　کیونکر روکوں؟ تو ہی بتا دے جوش پہ دریا میرا

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!

جانتی ہوں میں کہنا تیرا تنہائی میں ساتھی　　تنہائی میں ساتھی ہے تو من میں ہے کیوں بیتابی

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!

اپنی بہاریں تجھ پر واروں تن میں میرے جو تھی　　دیکھ بہاریں مرجھائیں گی دکھلا صورت تو اپنی

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!

کب تک تڑپوں رہ کے اکیلی تو ہی بتا تجھ پہ واری　　حسن حجازی جلد دکھا! آنکھیں دی ہیں جنکو مجازی

تو بے چین رکھا ہے کیوں؟ اے یثرب نگری والے!